رضیہ

کانوں میں چاندی کی بالیاں، گلے میں چاندی کی ہیکل، ہاتھوں میں چاندی کے کنگن اور پیروں میں چاندی کے کڑے، اودی آستینوں کی بوٹے دار قمیص پہنے، سیاہ ساری کے آنچل کو گلے میں لپیٹے، گورے چہرے پر جھولتے بالوں کو سنبھالنے میں منہمک، وہ چھوٹی سی لڑکی اس دن میرے سامنے آکھڑی ہوئی جب کہ میں اچانک اس کے گاؤں میں جا نکلا تھا۔ اس نے مجھے اپنے بچپن کے دنوں والی رضیہ یاد دلادی۔

ہاں، یہ میرے بچپن کی بات ہے۔ قصاب خانے سے رسّی توڑ کر بھاگے ہوئے بچھڑے کی طرح، میں اُچھلتا کودتا ابھی ابھی اسکول سے آیا تھا اور برآمدے کی چوکی پر اپنا بستہ اور سلیٹ پٹک کے، موسی (خالہ) سے جھپٹ کے ٹھکوے لے کر اُسے کُتر کُتر کے کھاتا ہوا، ڈھیکی پر جھولا جھولنے کا لطف حاصل کرنا چاہ رہا تھا کہ اُدھر سے آواز آئی —— "دیکھنا، بوا کا کھانا چھو نہ دینا" —— اور اسی آواز کے ساتھ میں نے

دیکھا، عجب رنگ روپ کی ایک لڑکی مجھ سے دو تین گز کے فاصلے پر ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی ہے۔

میرے لئے یہ رنگ روپ واقعی کچھ عجیب تھا۔ ٹھیٹھ ہندوؤں کا گاؤں ہے میرا۔ اور مجھے میلوں اور بازاروں میں زیادہ جانے نہیں دیا جاتا تھا، کیونکہ سنا ہے میں ایک میلے میں کھو گیا تھا ــــــ مجھے کوئی اُوگھر لئے جا رہا تھا کہ گاؤں کی ایک لڑکی کی نظر پڑ گئی اور مجھے نجات ملی۔ میں ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ ماں چل بسی تھیں، اس لئے اُن کی واحد امانت کو موسی آنکھوں میں سمو کر رکھتیں۔ میرے گاؤں میں بھی لڑکیوں کی کمی نہیں تھی، لیکن نہ تو اُن کا یہ پہناوا اوڑھاوا تھا نہ یہ روپ رنگ۔ میرے گاؤں کی لڑکیاں کانوں میں بالیاں کہاں ڈالتیں اور پوری آستینوں کی قمیص پہنے بھی انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ گورے چہرے تو ملتے ہیں، پر اس کی آنکھوں میں جو ایک عجیب نیلا پن تھا وہ کہاں؟ اور پورے چہرے کی تراش بھی یقینی نرالی تھی۔ جب ہی تو میں اُسے ٹکٹکی باندھے گھورنے لگا!

یہ بولی تھی رضیہ کی ماں، جسے میں اکثر چوڑیوں کی ٹوکری لے کے اپنے گاؤں میں آتے دیکھتا آیا تھا۔ وہ میرے آنگن میں چوڑیوں کی دکان پھیلائے بیٹھی تھی۔ اور بہتیری بہو بیٹیاں اسے گھیرے تھیں، منہ سے بھاؤ تاؤ کرتی اور ہاتھوں سے خریدنے والیوں کی کلائیوں میں چوڑیاں چڑھاتی، وہ سودے پٹائے جا رہی تھی اب تک اسے تنہا ہی آتے جاتے دیکھا۔ کبھی کبھی اس کے پیچھے پیچھے کوئی مرد بھی ہوتا جو چوڑیوں کی ٹوکری ڈھوتا، یہ بچی آج پہلی بار آئی تھی اور نہ جانے کس طفلانہ اشتیاق نے اسے میری سمت کھینچ لیا تھا۔ شاید وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ کسی کے ہاتھ کا

کھانا کسی کے نزدیک پہنچتے ہی چھو جاتا ہے! ماں کے اس اچانک چیخ اٹھنے پر وہ ٹھٹکی ہی تھی ـــــ اس کے پاؤں تو نہیں بندھ گئے؟ مگر اس ٹھٹک نے اُسے مجھ سے بہت قریب کر دیا، اس میں کوئی شک نہیں!

میری موسی جھٹ اٹھیں، کوٹھری میں گئیں اور دو ٹھکوے اور ایک کسار لا کر اس کے ہاتھوں پر رکھ دئے۔ وہ لیتی نہیں تھی۔ اپنی ماں کے اصرار پر ہاتھ میں رکھ تو لیا لیکن مُنھ سے نہیں لگایا۔ میں نے کہا۔ کھاؤ نا! کیا تمھارے گھر میں یہ نہیں بنتے؟ چھٹھ کا برت نہیں ہوتا؟ کتنے ہی سوالات ـــــ لیکن سب کا جواب بس ایک 'نہیں' وہ بھی منہ سے نہیں، ذرا گردن ہلا کر۔ اور گردن ہلتے ہی چہرے پر جھولتے ہوئے بالوں کی لٹیں جب ہل اٹھتیں تو وہ پریشان ہو کر انھیں سنبھالنے لگتی!

جب اس کی ماں نئی خریدنے والیوں کی تلاش میں میرے آنگن سے چلی تو رضیہ بھی اس کے پیچھے ہو لی۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر اور منھ دھو کر اب اس کے پاس پہنچ چکا تھا، اور جب وہ چلی، جیسے میں بھی کسی ڈور میں اس کے ساتھ بندھا تھوڑی دور تک گھسٹتا چلا گیا۔ شاید میرے جذبۂ شوق کو دیکھ کر ہی اس کی ماں منہاروں کے چہروں پر سدا کھیلنے والی ہنسی اور چُہل کے انداز میں بولی ـــــ بابو، رضیہ سے بیاہ کیجیے گا؟ پھر بیٹی کی طرف مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔ کیوں ری رضیہ یہ دولھا تجھے پسند ہے؟ اس کا یہ کہنا تھا کہ میں مڑ کر بھاگا۔ بیاہ! ایک مسلمان لڑکی سے؟ اب رضیہ کی ماں قہقہے لگا رہی تھی، اور رضیہ سمٹی ہوئی اس کے پاؤں سے چمٹی تھی۔ دور جا کے میں نے مڑ کر دیکھا۔

رضیہ، منہاری! وہ اسی گاؤں کی رہنے والی تھی بچپن میں اسی گاؤں میں رہی اور جوانی میں بھی۔ کیونکہ مسلمانوں میں اپنے گاؤں میں بھی شادیاں ہوجاتی ہیں نہ! اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ بہت دنوں تک اس سے اپنے گاؤں میں ہی ملاقات ہوجایا کرتی تھی!

میں پڑھتے پڑھتے بڑھتا گیا! بڑھنے پر پڑھنے کے لئے شہروں میں جانا پڑا۔ جب تب چھٹیوں میں آتا۔ ادھر رضیہ پڑھ تو نہ سکی۔ مگر بڑھنے میں مجھ سے پیچھے نہیں رہی۔ کچھ دنوں تک اپنی ماں کے پیچھے پیچھے گھومتی پھری۔ ابھی اس کے سر پر چوڑیوں کی ٹوکری تو نہیں چڑھی تھی، پر خریدنے والیوں کی کلائیوں میں چوڑیاں پہنانے کا فن وہ سیکھ چکی تھی! اس کے ہاتھ نرم تھے، بہت نرم، بہوؤں کی یہی رائے تھی۔ وہ سب اسی کے ہاتھوں چوڑیاں پہننا پسند کرتیں۔ اس کی ماں اس بات سے خوش ہی تھی۔ جب تک رضیہ چوڑیاں پہناتی، وہ نئی نئی خریدنے والیاں پھانستی۔

رضیہ بڑھتی گئی۔ جب ملاقاتیں ہوتیں، میں پاتا، اس کے اعضاء میں نئی نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اعضاء میں اور مزاج میں بھی! پہلی ملاقات کے بعد پایا تھا، وہ کچھ شوخ ہو گئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دوڑ کے پاس آجاتی، سوال پر سوال پوچھتی، عجیب اُلٹے سیدھے سوالات! دیکھئے تو، یہ نئی بالیاں آپ کو پسند ہیں؟ کیا شہروں میں بھی ایسی ہی بالیاں پہنی جاتی ہیں؟ میری ماں شہر سے چوڑیاں لاتی ہے، میں نے کہا ہے، وہ اس بار مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلے۔ آپ کس طرف رہتے ہیں وہاں؟ کیا ملاقات ہوسکے گی؟ وہ بکے جاتی،

میں سُنے جاتا۔ شاید وہ جواب کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتی۔

پھر کچھ دنوں بعد پایا، وہ اب کچھ جھجک رہی ہے۔ میرے پاس آنے سے پہلے وہ اِدھر اُدھر دیکھتی اور جب کچھ باتیں کرتی تو ایسی چوکنی سی، جیسے کوئی دیکھ نہ لے، سُن نہ لے۔ ایک دن جب وہ اسی طرح باتیں کر رہی تھی، میری بھاوج نے کہا۔ دیکھو ری رضیہ بواجی کو پُھسلا نہیں لیجو۔ وہ ان کی طرف دیکھ کے ہنس تو پڑی، پر میں نے پایا اس کے دونوں گال سُرخ ہو اُٹھے ہیں اور ان نیل گوں آنکھوں کے گوشے مجھے پُرآب سے لگے۔ تب سے میں نے دھیان دیا، جب کبھی ہم دونوں کہیں ملتے ہیں، بہت سی آنکھیں ہم پر برچھیاں سی تانے رہتی ہیں۔

رضیہ بڑھتی گئی، بچّی سے لڑکی ہوئی اور جوانی کے پھول اس کے جسم پر کھلنے لگے ہیں۔ اب بھی وہ اپنی ماں کے ساتھ آتی ہے، لیکن پہلے وہ ماں کے سائے جیسی لگتی تھی، اب اس کی اپنی ایک انفرادی آزاد حیثیت ہے۔ اور محض اس کا سایہ بننے کے لئے کتنوں کے دلوں میں کسمساہٹ ہے۔ جب وہ بہنوں کو چوڑیاں پہناتی ہوتی ہے، کتنے بھائی تماشہ دیکھنے وہاں جمع ہو جاتے۔ کیوں؟ اپنی بہنوں کے لئے برادرانہ شفقت، یا رضیہ کے سمت ایک لامعلوم کشش انھیں وہاں کھینچ لاتی؟ جب وہ بیویوں کے ہاتھوں پر چوڑیاں سرکاتی ہوتی، شوہر حضرات دور کھڑے کنکھیوں سے دیکھتے ہوتے۔ کیا؟ اپنی بیویوں کی نازک کلائیوں کو؟ —— یا ان کلائیوں پر رقص کرتی ہوئی رضیہ کی سبک انگلیوں کو! اور جیسے رضیہ کو بھی اس سے کیف حاصل ہوتا شوہروں سے چہلیں کرنے سے بھی وہ باز نہیں آتی۔ بابو! بہت باریک چوڑیاں ہیں! ذرا دیکھئے گا چٹک نہ جائیں! بیچ دیو بھاگتے ہیں، بیویاں کھلکھلاتی ہیں، رضیہ قہقہے لگاتی ہے۔

اب وہ اپنے پیشے میں مشّاق ہوتی جاتی ہے!

ہاں رضیہ اپنے پیشے میں مشّاق ہوتی جاتی تھی۔ منہاری کے پیشے کے لئے صرف یہی نہیں چاہئے کہ اس کے پاس رنگ برنگ کی چوڑیاں ہوں ــــ سستی، ٹکاؤ، نئے سے نئے فیشن کی۔ بلکہ یہ پیشہ چوڑیوں کے ساتھ چوڑی ہاریوں میں بناؤ سنگار روپ، رنگ ناز وادا بھی ڈھونڈتا ہے جو چوڑی پہننے والیوں کو ہی نہیں، ان کو بھی موہ سکے۔ جن کی جیبوں سے چوڑیوں کے دام نکلتے ہیں۔ کامیاب منہاری وہی ہے! رضیہ کی ماں بھی اپنے زمانے میں کچھ کم تھوڑا ہی رہی ہوگی؟ ــــ کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی!

شہر میں میرا رہنا جیسے جیسے زیادہ ہوتا گیا، رضیہ سے ملاقاتیں بھی کم ہوتی گئیں۔ اور ایک وہ دن بھی آیا کہ ایک عرصے کے بعد اسے اپنے گاؤں میں دیکھا! پایا اس کے پیچھے ایک نوجوان چوڑیوں کی ٹوکری سر پر لئے ہوئے ہے! دیکھتے ہی وہ سہمی، جھجکی اور میں نے مان لیا، وہ اس کا شوہر ہے! پھر بھی انجان سا پوچھ ہی بیٹھا ــــ اس مزدورے کو کہاں سے اٹھا لائی رے؟ اسی سے پوچھ لیجئے، ساتھ لگ گیا تو کیا کروں۔ نوجوان مسکرایا، رضیہ خوش ہوئی، بولی ــــ یہ میرا خاوند ہے مالک!

خاوند! بچپن کی اس پہلی ملاقات میں اس کی ماں نے مذاق ہی مذاق میں جو کہہ دیا تھا، نہ جانے وہ بات کہاں سوئی پڑی تھی؟ اچانک وہ جگی اور اس دن میری پیشانی پر شکنیں ضرور اُبھر آئی ہوں گی، مجھے یقین ہے۔ اور ایک دن وہ بھی آیا کہ میں بھی کسی کا خاوند بنا۔ میری رانی کو سہاگ کی چوڑیاں پہنانے اس دن یہی رضیہ

اور یہ منہ مانگی چیزیں ہاں نہیں ملیں تو وہ لوں گی کہ دلہن بی ٹاپتی رہ جائیں گی! ہٹ ری تو بوا جی کوے جائے گی تو پھر تیرا یہ حسن کیا کرے گا؟ ——— بھاوج نے کہا۔ وہ بھی ٹاپتا رہے گا۔ بھوجی، کہہ کے رضیہ کھلکھلا کے ہنس پڑی اور دوڑ کے حسن سے لپٹ گئی ——— اُو ہو میرے راجا، کچھ اور نہ سمجھ لینا! حسن بھی ہنس پڑا، رضیہ اپنی پریم کتھا سنانے لگی ——— کس طرح یہ حسن اس کے پیچھے پڑا۔ کس طرح جھنجھٹیں پیدا ہوئیں۔ پھر کس طرح شادی ہوئی۔ اور وہ آج بھی کس طرح سائے جیسا اس کے پیچھے لگا رہتا ہے ——— نہ جانے کون سا ڈر لگا رہتا ہے اسے؟ اور پھر میری رانی کی کلائی پکڑ کے بولی ——— مالک بھی اسی طرح تمہارے پیچھے سایہ بن کے لگے پھرتے رہیں دلہن! ساری انگنائی ہنسیوں سے گونج اٹھی تھی! اور ان ہنسیوں میں رضیہ کے کانوں کی بالیوں نے عجیب چمک بھر دی تھی۔ مجھے ایسا ہی لگا۔

جیون کا رتھ گھڑ دڑے راستے پر بڑھتا گیا۔ میرا بھی رضیہ کا بھی۔ اس کا پتہ اس دن چلا، جب بہت دنوں بعد اس سے اچانک پٹنہ میں ملاقات ہو گئی۔ یہ واقعہ اچانک تو ضرور تھا، لیکن کیا اسے ملاقات بھی کہا جائے؟

میں اب زیادہ تر گھر سے دور ہی رہتا۔ کبھی ایک آدھ دن کے لئے گھر گیا تو شام کو گیا، صبح بھاگا۔ طرح طرح کی ذمہ داریاں قسم قسم کے جنجال۔ ان دنوں میں پٹنہ میں تھا، یوں کہئے، پٹنہ سٹی میں۔ ایک چھوٹے سے اخبار میں تھا بیرا، باورچی، بہشتی کی طرح۔ ویسے تو لوگ سمجھتے ہیں اڈیٹر ہی ہوں۔ ان دنوں نہ اتنے اخبار تھے۔ نہ اتنے اڈیٹر۔ اس لئے میری بڑی قدر تھی، یہ تب جان پاتا،

جب کبھی دفتر سے نکلتا اور دیکھتا لوگ میری سمت اشارے کر کے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ لوگوں کا مجھ پر یہ دھیان ـــــ مجھے ہمیشہ اپنے عہدے کی عزت کا خیال رکھنا پڑتا۔

ایک دن میں چوک کے ایک مشہور پان والے کی دکان پر پان کھا رہا تھا، میرے ساتھ میرے چند مداح نوجوان تھے، ایک دو بزرگ بھی آ کے کھڑے ہو گئے۔ ہم پان کھا رہے تھے اور چہلیں چل رہی تھیں کہ ایک بچہ آیا اور بولا، بابو، وہ عورت آپ کو بلا رہی ہے۔

عورت بلا رہی ہے؟ چوک پر! میں چونک پڑا تو نوجوانوں میں کچھ ہلچل، بزرگوں کے چہروں پر کی پُر اسرار مسکراہٹ بھی مجھ سے چھپی نہیں رہی۔ عورت! کون؟ میرے چہرے پر غصہ تھا، وہ لڑکا سٹپٹا کے بھاگ گیا۔

پان کھا کے جب لوگ اِدھر اُدھر چلے، اچانک پاتا ہوں، میرے پاؤں اسی سمت اٹھ رہے ہیں۔ جس سمت اُس بچے نے انگلی سے اشارہ کیا تھا، تھوڑی دور آگے بڑھنے پر پیچھے مڑ کر دیکھا، شناساؤں میں سے کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ مگر، اس چوک کی شام کی رومانی فضا میں کسی کو کسی طرف دیکھنے کی کہاں فرصت! میں آگے بڑھتا گیا اور وہاں پہنچا، جہاں اس سے پورب، وہ پیپل کا درخت ہے۔ وہاں پہنچا ہی چاہتا تھا کہ دیکھا، درخت کے نیچے چبوترے کی طرف سے ایک عورت بڑھی چلی آ رہی ہے اور قریب پہنچ کے وہ کہہ اٹھی ـــــ سلام مالک!

میں دھک سے رہ گیا! لیکن پہچانتے دیر نہیں لگی ـــــ اس کے سر اٹھاتے ہی، چاندی کی بالیاں جو چمک اٹھیں!

رضیہ! یہاں کیسے؟ ——— میرے منہ سے نکل گیا۔

سودا سلف کرنے آئی ہوں مالک! لوگ اب نئی قسم کے ہو گئے ہیں نہ؟ اب لاکھ کی چوڑیاں کہاں کسی کو بھاتی ہیں؟ نئے لوگ، نئی چوڑیاں، سار سنگار کی کچھ اور چیزیں بھی لے جاتی ہوں۔ پوڈر، کلپ، کیا کیا چیزیں نہیں۔ نیا زمانہ؟ دلہنوں کے نئے مزاج ......

پھر ذرا سا رک کے بولی ——— سُنا تھا آپ یہیں رہتے ہیں۔ کہاں رہتے ہیں مالک؟ میں تو اکثر آیا کرتی ہوں۔

اور جب تک یہ پوچھوں کہ اکیلی ہو یا ــ کہ ایک ادھیڑ آدمی نے آکر سلام کیا۔ یہ حسن تھا لمبی لمبی ڈاڑھی۔ پانچ ہاتھ کا لمبا آدمی۔ لمبا اور مشٹنڈا بھی دیکھئے مالک! یہ آج بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتا! یہ کہہ کے رضیہ ہنس پڑی۔ اب رضیہ وہ نہیں تھی، لیکن اس کی ہنسی وہی تھی۔ وہی ہنسی، وہی چہل۔ اِدھر اُدھر کی بہتیری باتیں کرتی رہی۔ اور نہ جانے یہ سلسلہ کب تک جاری رکھتی کہ مجھے یاد آیا، میں کہاں کھڑا ہوں اور اب میں کون ہوں؟ کوئی دیکھ لے تو؟

مگر، وہ فرصت دے جب نہ؟ جب میں نے جانے کی بات کی، وہ حسن کی طرف دیکھ کے بولی ——— کیا دیکھتے ہو، ذرا پان بھی تو مالک کو کھلاؤ، کتنی بار بھر بھر پیٹ ٹھونس چکے ہو بابو کے گھر!

جب حسن پان لانے چلا گیا، رضیہ نے بتایا، کس طرح دنیا بدل گئی ہے۔ اب تو ایسے بھی گاؤں ہیں، جہاں ہندو مسلمانوں کے ہاتھوں سے سودے بھی نہیں خریدتے۔ اب ہندو منہار ہیں، ہندو درزی ہیں۔ اس لئے رضیہ جیسے آبائی پیشے والوں کو

بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑ گیا ہے۔ لیکن رضیہ نے یہ خوش خبری بھی سنائی، میرے گاؤں میں یہ پاگل پن نہیں اور میری رانی تو سوائے رضیہ کے کسی اور کے ہاتھوں سے چوڑیاں لیتی ہی نہیں۔

حسن کا لایا ہوا پان کھا کے جب میں چلنے کو تیار ہوا، وہ پوچھنے لگی کہ میری قیام گاہ کہاں ہے۔ میں سخت پس و پیش میں پڑا۔ ڈریئے نہیں مالک، تنہا نہیں آؤں گی، یہ بھی رہے گا! کیوں میرے راجا! —— یہ کہہ کے وہ حسن سے لپٹ گئی۔ پگلی، پگلی، یہ شہر ہے، شہر، —— یوں، حسن نے کہتے ہوئے اس سے باہیں چھڑائیں اور پھر بولا، بال بچوں والی ہوگئی، مگر اس کا بچپن نہیں گیا۔

اور دوسرے دن پاتا ہوں، رضیہ میری قیام گاہ پر موجود ہے! مالک، یہ چوڑیاں رانی کے لئے —— میرے ہاتھوں میں چوڑیاں رکھ دیں۔ میں نے کہا —— تم گھر پر جاتی ہی ہو، لیتی جاؤ، وہیں دے دینا۔

نہیں مالک، ایک بار اپنے ہاتھوں بھی پہنا دیکھئے۔ وہ کھلکھلا پڑی۔ اور جب میں نے کہا۔ اب اس عمر میں؟ تو وہ حسن کی طرف دیکھ کے بولی —— پوچھئے اس سے، آج تک مجھے یہی چوڑیاں پہناتا ہے یا نہیں؟ اور جب حسن کچھ شرمایا، وہ بولی —— گھاگھ ہے مالک، گھاگھ، کیا منہ بنا رہا ہے اس وقت، لیکن جب ہاتھ میں ہاتھ لیتا ہے .... کھلکھلا کے ہنس پڑی، اتنے زور سے کہ میں چونک کے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

ہاں، تو اچانک اس دن اس کے گاؤں میں پہنچ گیا۔ چناؤ کا چکر ——— جہاں نہ لے جائے، جس گھاٹ پانی نہ پلائے۔ ناک میں پٹرول کے دھوئیں کی بو۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں، چہرے پر گرد و غبار کا انبار ——— پریشان بدحواس، مگر اس گاؤں میں جیسے ہی میری جیپ داخل ہوئی، میں ایک خاص قسم کے جذبے سے متاثر ہو اُٹھا!

رضیہ کا گاؤں ہے، یہاں رضیہ رہتی تھی! لیکن کیا آج میں یہاں یہ پوچھ بھی سکتا ہوں کہ یہاں کوئی رضیہ نام کی منہاری رہتی تھی! یا ہے؟ حسن کا نام لیتے بھی شرم محسوس ہوتی تھی۔ میں وہاں لیڈر بن کے گیا تھا! میرا جے کار ہو رہا تھا، کچھ لوگ مجھے گھیرے کھڑے تھے۔ جس کے دروازے پر جا کر پان کھاؤں گا وہ اپنے کو خوش قسمت سمجھے گا جس سے دو باتیں کر لوں گا، وہ خود گفتگو کا ایک موضوع بن جائے گا۔ اس وقت مجھے کچھ اونچائی پر ہی رہنا چاہیئے۔

جیپ سے اُتر کے لوگوں سے باتیں کر رہا تھا، یا یوں کہئے کہ تصورات کے پہاڑ پر کھڑا ہو کے ایک آنے والے سنہرے زمانے کا پیغام لوگوں کو سُنا رہا تھا، مگر دماغ میں کچھ گتھیاں سی الجھ رہی تھیں۔ زبان حسب عادت کام کئے جا رہی تھی، دل کے اندر کچھ اور ہی تانا بانا بُنا جا رہا تھا۔ دونوں میں کچھ مناسبت نہیں تھی، لیکن ان میں سے کسی ایک کی رفتار میں بھی کیا رکاوٹ ڈالی جا سکتی تھی؟

کہ اچانک، لو، یہ کیا؟ وہ رضیہ چلی آ رہی ہے۔ رضیہ! وہ بچی! ارے رضیہ پھر بچی ہو گئی؟ کانوں میں وہی بالیاں، گورے چہرے پر وہی نیلگوں آنکھیں وہی پوری آستینوں کی قمیص، وہی لٹیں جنھیں سنبھالتی بڑھی آ رہی ہے۔ درمیان میں

چالیس پینتالیس سال کی کھائی! ارے، میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ خواب؟ دن کو خواب؟ وہ آتی ہے، نڈر جیسی، بھیڑ کو چیرتی میرے قریب پہنچتی ہے، سلام کرتی ہے اور میرا ہاتھ پکڑ کے کہتی ہے —— چلئے مالک، میرے گھر!

میں ششدر رہوں، کچھ سوجھ بوجھ نہیں رہا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ لوگ مسکرا رہے ہیں! نیتاجی آج آپ کی قلعی کھل کے رہی! نہیں یہ خواب ہے۔ کہ کانوں میں آوازیں آئیں، کوئی کہہ رہا ہے —— کیسی شوخ لڑکی! اور دوسرا بولتا ہے —— بالکل اپنی دادی جیسی! اور تیسرے نے میرے ہوش کی دوا دی —— یہ رضیہ کی پوتی ہے بابو! بیچاری بیمار ہے؟ آپ کا ذکر اکثر کیا کرتی ہے! بے حد تعریفیں کرتی ہے! بابو فرصت ہو تو ذرا دیکھ لیجئے اُسے، نہ جانے بچاری زندہ رہتی ہے یا . . . .

میں رضیہ کے آنگن میں کھڑا ہوں۔ یہ چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے گھر، یہ لیپا پتا جیسا ستھرا آنگن، بھری پڑی گرستھی —— محنت اور دیانت کی دین! حسن چل بسا ہے، لیکن اپنے بعد تین حسن چھوڑ گیا ہے۔ بڑا بیٹا کلکتے میں کماتا ہے، منجھلا آبائی پیشے میں لگا ہے، چھوٹا شہر میں پڑھ رہا ہے۔ یہ بچی بڑے بیٹے کی بیٹی ہے۔" دادا کا سر پوتے میں اور دادی کا چہرہ پوتی میں!" ہو بہو رضیہ —— دوسری رضیہ، یہ دوسری رضیہ میری انگلی پکڑے آنگن سے پکار رہی ہے —— دادی، او دادی گھر سے نکل، مالک دادا آ گئے! لیکن پہلی رضیہ نکلتی نہیں! کیسے نکلے؟ بیماری کے میلے کچیلے کپڑوں میں میرے سامنے کیسے آئے؟

رضیہ نے اپنی پوتی کو بھیج تو دیا، لیکن اُسے یقین نہیں تھا کہ وہ ہوا گاڑی، پر آنے والے نیتا اس کے گھر تک آنے کی تکلیف کریں گے۔ اور جب سُنا، میں آ رہا ہوں، تو بہوؤں سے کہا، ذرا کپڑے تو بدلوا دو —— مالک سے کتنے دنوں بعد ملاقات ہو رہی ہے نہ؟

اس کی دونوں بہوئیں اُسے سہارا دے کے آنگن میں لے آئیں۔

رضیہ —— ہاں، میرے سامنے رضیہ کھڑی تھی۔ دُبلی پتلی، روکھی سوکھی، مگر جب نزدیک آ کے اس نے 'مالک سلام' کہا، اس کے چہرے سے پل بھر کے لئے وہ جھرّیاں کہاں چلی گئیں، جنھوں نے اس کے چہرے پر مکڑی کا جال بُن رکھا تھا؟ میں نے دیکھا، اس کا چہرہ بجلی کے قمقمے کی طرح چمک اٹھا اور چمک اٹھیں وہ نیلگوں آنکھیں، جو گڈھوں میں دھنس گئی تھیں! اور، ارے چمک اٹھی ہیں آج پھر وہ چاندی کی بالیاں اور دیکھو، اپنے دلوں کو پاک کر لو۔ اس کے چہرے پر پھر اچانک جھول کر چمک رہی ہیں، وہ لٹیں، جنھیں زمانے نے دھو پونچھ کر سفید و شفّاف بنا دیا ہے۔

بلدیو سنگھ

ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح ایک دن ہم نے اچانک اپنے درمیان آکر اُسے دھم سے گرتا ہوا پایا ـــــ روشن، تاباں، منّور! اور اُسی تارے کی طرح ایک لمحہ چمک دکھلا، ہمیں چکا چوندیں ڈال، وہ ہمیشہ کے لئے چلتا بنا۔ جس دن وہ آیا، ہمیں تعجب ہوا، جس دن وہ گیا، ہم دم بخود رہ گئے۔

پوس کی صبح تھی۔ کھلیان میں دھان کے پوچھوں کا انبار لگا تھا۔ ان کی رکھوالی کے لئے جھونپڑی بنی تھی۔ اس کے سامنے الاؤ جل رہا تھا۔ کھیت میں کھلیان پر، ہر چہار طرف ہلکا کہرا چھایا ہوا تھا، جسے چھید کر آنے میں سورج کی ننھی کرنوں کو دقت ہو رہی تھی۔ سردی کافی تھی۔ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہوا سنک کر کلیجے کو ہلا جاتی۔ سب لوگ الاؤ کو گھیرے ہوئے تھے جس کی لپیٹ ختم ہو چکی تھی۔ ہاں، لال انگارے چمک رہے تھے۔ جیوں جیوں انگاروں پر راکھ

کی تہیں جمتی جائیں، ہم الاؤ سے نزدیک تر ہوتے جاتے جیسے ہم انگاروں کو سینوں میں رکھ لینا چاہتے ہوں۔ کافی سناٹا تھا۔ دونی کے لئے، کھلیان کے بیچ میں، جو بانس کا کھمبا گڑا تھا، اس کے دھان کے خوشوں والے جھبیدار سرے پر ایک سیاہ 'بھوجنگا' پرندہ بیٹھا تھا۔ وہ کبھی کبھی چیخ کے اس سناٹے کو توڑنے کی حقیر سی کوشش کر رہا تھا۔

اسی وقت ایک نوجوان آیا اور دور سے ہی میرے ماما کو دیکھ کے چلا اٹھا ——— "پالاگی چاچاجی!" ہم سب کا دھیان اس کی طرف کھنچ گیا۔ ایک گبرو جوان ——— ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ رنگ گورا، جس پر ننھی کرنوں نے سونا پوت رکھا تھا۔ دائیں ہاتھ میں بانس کی لمبی لال لاٹھی ——— بڑی سجیلی، گھنے پوروں والی، گاؤدم سی آتاروالی! بائیں ہاتھ میں لوٹا لئے ——— وہ رفع حاجت کے بعد لوٹ رہا تھا۔ بادامی رنگ کا کھدر کا جو لمبا خلتہ کرتا اس نے پہن رکھا تھا، اس کے اندر سے اس کے جسم کا گٹھیلاپن اور حسن پھوٹا پڑتا تھا۔

"ارے بلدیو، تم کب آئے؟ بہت دنوں بعد دکھائی دئے ...... پورب کماتے ہو؟ خوش رہو، لیکن ہم لوگوں کو بھی تو نہ بھولو! شاید دو سال پر آئے ہو۔" یوں ہی ماماجی نے اس سے پوچھ گچھ کی۔

بڑے انکسار سے اُس نے معافی مانگی، پھر بولا ——— چاچاجی، اب سوچا ہے، یہیں رہوں گا، بہت دنیا دیکھی، جی کہیں نہیں لگا۔ نانیہال سے بھی جی اُوب گیا؟ یہ آبائی زمین جیسے ڈور لگا کے کھینچتی رہتی ہے۔ اسی لئے آیا ہوں گھر بسانے۔ گھر تیار کر کے ماں کو بھی نانیہال سے لے آؤں گا۔ سوچتا ہوں، آپ

ہی لوگوں کی سیوا میں زندگی بتادوں"۔

نوجوانوں کو جب معلوم ہوا، بلدیو سنگھ یہیں بسیں گے تو ان کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ بلدیو سنگھ کے پتا بھری جوانی میں مرے۔ بلدیو، اس وقت چھوٹے بچے تھے۔ ان کی ماں انھیں لے کے میکے چلی گئیں اور تب سے وہ بیچاری وہیں ہیں۔ جوان ہونے پر بلدیو، پورب، جانے آنے لگے، وہاں بنگال میں کسی راجا کے دربار میں پہلوانی کرتے۔ کافی پیسے ملے۔ اب انھیں آبائی زمین کی یاد آئی تھی۔

وہ گھر جو کھنڈر بنا تھا، پھر ایک بار آباد ہوا۔

ان کے آنے سے گاؤں میں ایک نئی جان آگئی ——— جان آگئی، جوانی آگئی۔ اکھاڑا کھد گیا۔ اس میں کشتیاں ہونے لگیں۔ علی الصبح کشتیاں، شام کو پٹے بازی، گدکا، لاٹھی وغیرہ۔ پیٹھیا (ہاٹ) کے دن بلدیو سنگھ جب شاگردوں کی ٹولی لے کر، دل بل کے ساتھ چلتے، تو دیکھتے ہی بنتی!

آگے آگے بلدیو سنگھ جا رہے ہیں۔ پیروں میں بوٹ، جو وہ بنگال سے لائے تھے۔ کمر میں دھوتی، جسے جانگھیے کی طرح عجیب ڈھنگ سے پہنتے، جو گھٹنوں سے کچھ ہی نیچے جاتی، گھٹنوں کے نزدیک اس میں چنٹ ہوتی، جو چلتے وقت لہراتی رہتی، لمبا کرتا۔ گریبان بغل میں، جس میں ایک ہی تکمہ ہوتا۔ کرتا کافی گھیر دار، ہاتھ کا گھیرا اتنا بڑا کہ ہاتھی کا پاؤں سما جائے۔ اس میں گلے میں سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹھوس تعویذوں کی قطار ——— جن میں کچھ چوکور اور کچھ ہلالی۔ سر پر کلغی دار پگڑی، جس کا ایک لمبا سرا ان کی پیٹھ پر جھولتا ہوتا۔ ہاتھ میں سرسوں کے تیل اور کچے دودھ سے پالی پوسی، سرخ لمبی لاٹھی ہوتی، یا کبھی کبھی وہ موٹا

ڈنڈا ہوتا جس میں، کرتے کے نیچے، کمر سے لٹکتی ہوئی، گڑاسے کی پھلی، بات کی بات میں فِٹ کرکے، وہ سراپا ملک الموت بن سکتے تھے! اپنی طاقت اور ہمت پر انھیں اتنا اعتماد تھا کہ جھومتے ہوئے، سر اٹھائے، سینہ تانے، شیر کی طرح چلتے۔ آگے آگے وہ پیچھے پیچھے، اسی سج دھج اور روپ رنگ میں ان کے شاگردوں کی ٹولی ہوتی۔ راستے میں، پنگھٹ پر، ہاٹ میں، پیٹھیا میں ان کا خوب صورت، سڈول جسم دیکھ کے کس کی آنکھیں نہ چمک اٹھتیں۔

جسم میں اتنی طاقت، لیکن مزاج کیسا؟ ——— بچوں سا معصوم، بھولا، ہونٹوں پر ہمیشہ ہنسی کھیلتی رہتی۔ سب کے ساتھ انکساری سے پیش آتے، کبھی غصہ ان میں نہیں دیکھا گیا۔ سب کی خدمت کے لئے ہمیشہ تیار! بچے انھیں دیکھتے ہی لپٹ جاتے۔ بوڑھوں کی آنکھیں ہمیشہ ان پر دعائیں برساتیں، جوانوں کے تو وہ دیوتا ہی بن چکے تھے۔

ان دنوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کھنچاؤ نہیں تھا۔ دونوں شیر و شکر کی طرح گھلے ملے تھے۔ ہندوؤں کی ہولی میں مسلمانوں کی داڑھیاں رنگی ہوتیں، مسلمانوں کے تعزیوں میں ہندوؤں کے کندھے لگے ہوتے۔

عشرۂ محرم کے دن تھے۔ میرے گاؤں میں بھی تعزیہ بنتا تھا۔ حالانکہ ایک بھی مسلمان وہاں نہیں تھا۔ ایک بوڑھے مولوی صاحب بلائے جاتے، جو مذہبی رسوم ادا کرتے۔ ہمیں واسطہ تھا صرف تعزیئے کے پاس شور و غل مچانے سے۔ شام ہوئی، گاؤں کے سب لوگ اکٹھے ہوئے، تاشے بج رہے ہیں، لکڑی کھیلی جا رہی ہے۔ گدکے بھانجے جا رہے ہیں، پٹے بازی ہو رہی ہے۔ لاٹھیوں کے کھیل،

طرح طرح کے جسمانی کرتب، عورتیں اور بچے مرثئے کے نام پر شور مچا رہے ہیں۔ یوں ہی کھیل کود میں آدھی رات گزر جاتی۔

تعزئے کے پہلام کا دن آیا۔ گاؤں سے دور راجپوتوں کی ایک بستی میں، 'رن' سجتا۔ وہیں جوار بھر کے تعزئے اکٹھے کئے جاتے۔ لوگوں کی اتھاہ بھیڑ، طرح طرح کے رنگین کپڑوں کی چمک دمک، بوڑھے، جوان، بچے، عورتیں، طرح طرح کے مارو باجے، ڈنکے —— مرثئے کی میٹھی دھنوں میں 'یا علی' کا فلک شگاف نعرہ! ہمتیں کانپتیں، آسمان تھراتا، دل اچھلتے، جوار بھر کے نوجوانوں کا یہی تو دن ہے، بن ٹھن کے آئے ہوئے ہیں۔ کہیں کشتیاں ہو رہی ہیں، کہیں مینڈھے لڑائے جا رہے ہیں۔ کہیں لاٹھی اور گدکے اور لکڑی میں ہاتھ کے کرامات دکھائی جاتی۔ دیکھتے دیکھتے تماشائیوں کا گروہ مختلف دلوں میں بٹ جاتا۔ کوئی ایک کو شاباشی دیتا، کوئی دوسرے کو۔ دونوں دل اپنے اپنے 'ہیرو' کی جیت چاہتے۔ کبھی کبھی اس 'دلاور پرستی' کے سبب، للکاریں لگ جاتیں، آنکھیں لال ہو اٹھتیں۔ بازو پھڑکنے لگتے، معلوم ہوتا، اب مڈبھیڑ ہو کر رہے گی۔ لیکن، عموماً اس جذبے پر عقل کو کامیابی حاصل ہوتی، تھوڑی دیر میں سمندر کا جوار اتر جاتا۔ پھر آنکھوں میں رس ہونٹوں پر ہنسی۔

ہم سب بھی اپنا تعزیہ لئے 'رن' پر پہنچے تھے۔

ایک جگہ مینڈھے لڑائے جا رہے تھے، میں اسی کو دیکھ رہا تھا۔ مینڈھوں کی لڑائی —— واہ کیا کہنا، یہ چھوٹے جھبرے جانور —— جو اپنے مالکوں کے پیچھے معصوم بنے پھرتے —— ایک دوسرے پر کس طرح ٹوٹ

پڑتے۔ ان کی سنگیں جب ٹکراتیں، زوردار آواز کے ساتھ، جیسے دھواں سا اُٹھنے لگتا! ٹکر پر ٹکر ـــــــ جب تک ان میں سے ایک گر نہ جائے، یا انھیں پکڑ کر علیحدہ نہ کر دیا جائے۔ لڑانے سے پہلے لال مرچ ان کے منہ میں رکھ کے جیسے انھیں اور بھی مشتعل کر دیا جاتا۔ میں پورے اِنہماک سے بینڈھوں کی یہ لڑائی دیکھ رہا تھا، کہ ....

یکایک۔ بڑے زور کا شور وغل مچا۔ سبھی ایک سمت دوڑے جا رہے ہیں۔ اور، وہاں لاٹھیوں کی کھٹا کھٹ جاری ہے۔ یہ کھٹا کھٹ کھیل کی نہیں، کئی کے سروں سے خون کے فوّارے چھوٹ رہے ہیں۔

اور یہ، بیچ میں کون ہے؟ بلدیو سنگھ! ـــــــ پرانے ہنس مکھ، رسیلے بلدیو سنگھ، نہیں۔ یہ بلدیو سنگھ سراپا بھیم بنے ہوئے ہیں! آنکھوں سے انگارے برس رہے ہیں، سر پر جو ایک لاٹھی لگی ہے۔ اس سے خون نکل کے پیشانی پر ہوتا، ابروؤں کے اوپر جم کے وہ ایک لوندا سا ہو گیا ہے۔ دونوں ہاتھوں میں لاٹھی پکڑے وہ تیزی سے چلائے جا رہے ہیں۔ اس شکل میں جس طرح نکل جاتے بھگدڑ رچ جاتی! دیکھئے ـــــــ ایک آدمی ان کی طرف لاٹھی سنبھالے بڑھا اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ اس نے لاٹھی چلا ہی تو دی، جھٹ اپنی لاٹھی کے دونوں سروں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے سر کے اوپر لے گئے، اس کی لاٹھی کی چوٹ اسی پر ٹھائیں سے آ کے لگی ـــــــ دوسری بار، پھر تیسری بار۔ بار بار وار۔ بیکار جاتا دیکھ، وہ بھاگا۔ لیکن، اب بلدیو سنگھ کی باری ہے ـــــــ بلدیو سنگھ کی ایک لاٹھی، اور وہ چکرا کے زمین پر گرا، ارے یہ کیا ہونے والا ہے؟

چاروں طرف ہائے توبہ مچی تھی۔ بھگدڑ مچ گئی تھی۔ اب وہاں مہابھارت ہو کر رہے گا۔ سب قیاس کر رہے تھے۔ کون کس کو کیا کہہ کر سمجھائے، کون کس کی سننے والا تھا۔ پھر بلدیو سنگھ کو شانت کئے بغیر، کیا امن قائم ہو سکتا تھا؟

فوراً ہمارے بوڑھے ماماجی آگے بڑھے۔ چلا کر کہا ——— "بلدیو!" بلدیو سنگھ کو جیسے لرزہ آگیا، پاؤں جم گئے، ہاتھ رک گئے۔ لیکن فوراً ہی سنبھل کے بولے "چاچاجی، آپ نہ روکئے، ان لوگوں کو لاٹھی کا گھمنڈ ہو گیا ہے۔ میں ذرا انھیں بتا دینا چاہتا ہوں۔ لاٹھی کیا چیز ہے؟" ان کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ غصے میں باتیں ٹوٹ ٹوٹ کے نکلتیں۔ درحقیقت بلدیو سنگھ کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا، انھیں مجبوراً کودنا پڑا تھا۔ کشتی کا ایک جوڑ ہو رہا تھا۔ دونوں پہلوان بلدیو سنگھ سے ناواقف تھے۔ اُن میں سے ایک نے "فاؤل پلے" کرنا چاہا۔ بلدیو سنگھ نے الگ سے ہی روکا، منع کیا "ایسا کرنا مناسب نہیں"۔ بس اُن کی بات سنتے ہی اس کے طرف دار اُن پر بگڑے، غرائے۔ وہ لوگ غرائے۔ کیونکہ وہ لاٹھی چلانے میں، قرب وجوار میں سرغنہ سمجھے جاتے تھے۔ انھیں گھمنڈ تھا کہ ان کے سو خون معاف ہیں۔ لیکن بلدیو سنگھ ان کی دھونس میں کب آنے والے تھے؟ بات بات میں تلخی بڑھ گئی، اور اس کا یہ نتیجہ تھا۔

خیر ماماجی کے درمیان میں پڑنے سے بلدیو سنگھ شانت ہوئے۔ لیکن اب تو ان کی جیت بھی ہو چکی تھی، میدان ان کے ہاتھ رہا۔ ان کے شاگردوں کی ٹولی کے ساتھ، ہم انھیں بڑی شان سے گھر لائے! ——— ہم آج

فاتح تھے، ہمارا گاؤں فاتح تھا، گویا رام لنکا کو فتح کرکے اجودھیا لوٹے تھے۔

اگر شیر شاہ یا شیواجی کے دن ہوتے، تو بلدیو سنگھ فوج میں بھرتی ہوئے ہوتے، اور سپاہی سے، ہوتے ہوتے، صوبہ دار تک ہو گئے ہوتے، اس میں تو کوئی شک نہیں۔ صورت، شکل، طاقت، ہمّت، یہ سبھی خصوصیتیں ان میں موجود تھیں، جو نظام جاگیرداری کے اُس دور میں، انھیں اچھے فوجی عہدے پر پہنچا دیتیں، اُس وقت کس شان سے ہمارے گاؤں میں آتے! گھوڑے پر سوار —— کلغی دار پگڑی، اکڑی کڑی مونچھیں، آگے پیچھے نوکر چاکر، لیکن انگریزی حکومت میں یہ کب ممکن تھا؟ ہاں، جو ممکن تھا وہی ہم دیکھ رہے تھے۔ بہادری اپنے نکاس کا کوئی راستہ تو بنا ہی لیتی ہے!

یہ ہماری بستی بڑی عجیب ہے۔ چاروں سمت راجپوتوں اور اہیروں کا ٹھٹھ —— راجپوتوں میں اگر رام کی شان، تو گوالوں میں کرشن کی یاد دی آن بان۔ دونوں ذاتوں میں جیسے خاندانی بیر چلی آ رہی ہو۔ چھوٹی چھوٹی بات پر تناؤ ہو جاتا، مونچھیں کڑی ہو جاتیں، آنکھیں لال ہو اٹھتیں اور لاٹھیاں چل کے رہتیں۔ اگر دونوں ذاتیں دو گروہ کی حیثیت سے لڑتی تھیں، تو خود گروہ کے اندر بھی آپس میں جنگیں جاری رہتیں۔ بھائی بھائی میں، پڑوسی پڑوسی میں۔ ایک بالشت زمین کے لئے، آم کے پھل کے لئے، شیشم کی ایک شاخ کے لئے، خون کے فوارے چھوٹتے۔ یہ جنگیں، عموماً اچانک ہوتیں، کھیت کی جتائی ہو رہی ہے، درخت کے نیچے غپ شپ ہو رہی ہے،

راستہ چلتے چلتے بھی، لوگوں میں گھتم گتھا ہو جاتی۔ لیکن کبھی کبھی جم کے بھی لڑائیاں ہوتیں۔ دونوں طرف سے لوگوں کا اجتماع ہوتا ـــــــ بھائی بند جٹتے، رشتے قبیلے کے افراد اکٹھے ہوتے، کچھ لوگ پیسوں پر بھی بلائے جاتے۔ ایسے موقعوں پر ہمارے قرب وجوار میں کہیں بھی جم کے کوئی لڑائی ہوتی تو، بلدیو سنگھ ایک نہ ایک طرف سے ضرور بلائے جاتے، اور جدھر سچائی اُدھر جیت، کے مصداق، جس طرف بلدیو سنگھ ہوتے اُس فریق کی جیت بھی یقینی ہوتی۔

ایک بار اسی طرح کا 'دھرم یُدھ' دیکھنے کا موقع مجھے ملا۔ بشن پور میں دو بھائی چھتری تھے۔ دونوں کی دانت کاٹی روٹی تھی۔ لیکن آخر میں دل پھٹا، تو ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن کے رہے۔ گھر، دروازہ، کھیت کھلیان سب کا بٹوارہ ہو چکا تھا۔ دونوں ایک انگنائی رہتے ہوئے بھی جیسے دو دنیا کے باشندے تھے۔

اتفاق سے اس سال آم کے ایک درخت کے لئے دونوں بھائیوں میں تناتنی ہو گئی۔ وہ لنگڑے آم کا پیڑ! ـــــــ ہم نے جا کے دیکھا پھلوں کے گچھوں سے لدی اس کی ہر ایک شاخ جیسے زمین چھونے کو جھک رہی ہو۔ ہرے ہرے پتے، ان سفیدی لئے آموں میں نہ جانے کہاں چھپ رہے تھے؟ کافی پرانا درخت تھا، خوب پھل گیا تھا۔ اور سال بھی اچھا پھل دیتا تھا، لیکن اس سال تو دروپدی کی ساڑی بن کے، مہا بھارت بن کے آیا تھا! پھر یہ للچانے والا جھیس کیوں نہ اختیار کر لیتا۔

کہتے ہیں، یہ درخت بسنت چکا تھا۔ چھوٹے بھائی کے حصے میں پڑا تھا، جو کئی سال سے اس کے پھل کا استعمال کر رہا تھا۔ لیکن بڑے بھائی کے لڑکے نے حساب لگا کے دیکھا۔ یہ آم تو میرے حصے کا ہے۔ دھوکے سے چچا جی کو مل گیا ہے درختوں کی گنتی ——— کھتیان سب کو وہ اپنے حق میں پیش کرتا۔

لیکن یہاں کھتیان سے کیا ہونے والا ہے؟ "اگر تمھارا ہے، مرد بچہ بن کے چڑھ کے، آؤ، پھل توڑ لو، کھاؤ۔ ورنہ بیوی کے آنچل سے منہ ڈھانک کے سوؤ۔" سیدھی منطق، سیدھی بات! جواب میں ایک دن مقرر کر دیا گیا: اگلے سوموار کو، ڈنکا بجا کے، ہم پھل توڑیں گے ——— چھپے چوری جو کام کرے اُس کی ایسی تیسی۔" دن طے ہوا، وقت طے ہوا۔ دونوں طرف سے اجتماع ہونے لگا۔

بلدیو سنگھ کے پاس بھی دونوں طرف سے دعوتیں آنے لگیں۔ لیکن یہاں تو کرشن جی والی شرط تھی۔ جو خود میرے پاس آئے گا، اس کا ساتھ دوں گا! یہ خط و کتابت کیا چیز ہے؟ بڑے بھائی کا بیٹا، ایک دن گھوڑے پر پہنچا۔ اس سے بات چیت ہو رہی تھی کہ چھوٹے بھائی بھی پہنچے۔ لیکن تب تک بلدیو سنگھ زبان دے چکے تھے۔ دوسرے دن شاگردوں کی ٹولی کے ساتھ، وہ لشن پور جا پہنچے۔

آج ہی فوجداری ہونے والی ہے۔ لڑائیوں سے دور ہی رہنا چاہیے کیونکہ اکثر بے قصور اس میں پھنس جاتے ہیں، پٹ جاتے ہیں۔ بڑے بوڑھوں کی نصیحت کو بالائے طاق رکھ کے، میں اشتیاق میں، تماشائیوں کی اس بھیڑ میں شامل

ہو گیا، جو مختلف سمتوں سے بشن پور جا رہی تھی۔

بشن پور اس دن "کروکشیتر" بنا ہوا تھا۔ بیچ میں وہ آم کا درخت، ساکت جامد کھڑا ہے، دونوں طرف دونوں فریقوں کی جماعتیں جٹی ہیں، بھالوں کی انیاں دھوپ میں چم چم کر رہی ہیں۔ گرڑاسے دن کو بھی چاند کی طرح چمک رہے ہیں! پھرسے پرشورام کی یاد دلا رہے ہیں، لاٹھیاں اچھل رہی ہیں —— دھامن سانپ کی طرح، ہاں تلواروں کی بہت کمی ہے۔ کیونکہ انگریزی حکومت کی منحوس نظر اس پر پڑ چکی تھی۔ پھر لٹھیتوں کا کیا کہنا تھا، جو مار بھالوں اور پھرسوں کی ہوتی ہے، وہ تلوار کی کہاں؟ میں ان کی دلیلوں میں کھویا نہیں تھا، میری مسحور متحیر نگاہیں تو ان تیاریوں کو دیکھ رہی تھیں۔ روبرو ان دونوں گروہوں کے دل تھے، تماشائیوں کی بھیڑ دونوں بازوؤں میں تھی رہ رہ کے نعرے بلند ہوتے، للکاریں اٹھتیں۔ کبھی کبھی، "آلہا" کے چند بند بھی سنائی پڑتے۔

بولو مہابیر سوامی کی جے! —— کہہ کے دونوں دل کے سپاہی آم کی طرف بڑھے۔ تماشائیوں کے کلیجے دھک دھک کرنے لگے۔ ارے کچھ دیر میں ہی ان میں سے چند مر چکے ہوں گے، کچھ زخمی پڑے ہوں گے۔ اف! —— میرے منہ سے اچھی طرح نکل بھی نہ پایا کہ دیکھا، بڑے بھائی کی طرفداری میں سب سے آگے بلدیو سنگھ ہیں۔ سب سے آگے بلدیو سنگھ ان کے دونوں بازو میں، میرے ہی گاؤں کے، ان کے دو شاگرد رشید، بلدیو سنگھ کے سر پر زعفرانی رنگ کی پگڑی ہے۔ پاؤں میں وہی بوٹ، وہی لمبا چوڑا کرتا جسم پر، لیکن، اس کے گھیر کو کمر پر ایک پٹکے سے کس

رکھا ہے۔ تاکہ چستی سے اُچھلنے کودنے میں دقت نہ ہو۔ ان کی دھوتی تو عموماً ہاف پینٹ کا کام کرتی ہی تھی! چہرہ کیا سُرخ انگارہ بنا ہوا تھا!

وہ آگے بڑھے آم کے درخت کے پاس پہنچے۔ دونوں شاگردوں کو اشارہ کیا، وہ فوراً درخت پر چڑھ گئے اور لگے آم کی شاخ کو جھکولے دے کر بیرحمی سے پھلوں کو گرانے۔ کوئی ماں کا لال ہے، تو آئے —— بلدیو سنگھ چنگھاڑ اٹھے۔ ان کی طرف، مخالف گروہ متحیر دیکھ رہا تھا، جیسے وہ بھی تماشائیوں کی ہی جماعت ہو، لیکن ان کے اس چیلنج سے جیسے دشمن میں احساس خودی پیدا ہوا۔ پھر کیا تھا دونوں جماعتوں میں گتھم گتھا شروع ہو گئی۔ لاٹھیوں کی کھٹا کھٹ، گڑاسوں کی چھپا چھپ، برچھوں کی سنسناہٹ فضا میں گونج رہی تھی۔ نعروں کے ساتھ ساتھ ہا ہا کار بھی —— کسی کے سر پر لاٹھی لگی۔ کھوپڑی پھٹ کے دو ٹکڑے! زخمی گرا اور خون کی دھار بہہ نکلی! کسی کے پیٹ میں بھالا چبھا۔ بھالے کی نوک کے ساتھ آنتیں باہر آ گئیں۔ آنتوں کو دونوں ہاتھوں سے تھامے وہ منہ کے بل پڑا ہے۔ جو ہاتھ ایک منٹ پہلے لاٹھی گھما رہا تھا، گڑاسے کے ایک ہی وار نے اسے جسم سے الگ کر دیا ہے —— وہ خون میں لت پت اب بھی رہ رہ کر اچھل پڑتا ہے!

چاروں طرف خون، چیخ! میری تو آنکھیں مند گئیں۔

جب آنکھیں کھلیں تو سارا قصہ تمام تھا۔ درخت پر بڑے بھائی کا قبضہ ہو چکا تھا۔ قبضہ حاصل کرنے میں بلدیو سنگھ کا بڑا ہاتھ تھا۔ میں اپنے اس ہیرو کو دیکھنا چاہتا تھا، لیکن، معلوم ہوا، پولیس سپرنٹنڈنٹ صاحب اب،

تماشا ختم ہو چکنے پر، تشریف لائے ہیں۔ اور لوگوں نے بلدیو سنگھ کو وہاں سے ہٹا دیا"۔ بلدیو سنگھ! فتح تمھاری ہوئی، "اب روپیوں کا کھیل ہے؟ تم ہٹ جاؤ اب کام میرا ہے"۔ "یہ بڑے بھائی کے صاحبزادے نے کہا اور جاتے وقت بلدیو سنگھ کے گلے میں ایک 'مہرمالا' ڈال دی۔

اور اسی بلدیو سنگھ کی یہ لاش ہمارے سامنے پڑی ہے! سر چور چور۔ جیسے کچومر بنا دیا گیا ہو! دھول اور خون سے لت پت! جس پیشانی سے نور برستا، اسی پر مکھیاں بھنک رہی ہیں! ایک آنکھ دھنس گئی ہے، دوسری باہر نکل آئی ہے! ہونٹ کو چھید کر دانت باہر نکل آئے ہیں۔ نہیں، نہیں، یہ ہمارا بلدیو سنگھ نہیں ہو سکتا ——— ! بلدیو سنگھ کی یہ دُرگت؟

ایک گڑھا سا، گہرا، کاندھے پر لگا ہے۔ وہ بازو جھول گیا ہے! دوسرے ہاتھ کا پورا پنجہ غائب! سینہ اُسی طرح "تنا ہوا ہے ——— پہلے سے کچھ زیادہ ہی پھولا ہوا! لیکن پیٹ سے ساری آنتیں باہر نکلی پڑی ہیں۔ آنتوں کا یہ ڈھیر! ——— اُف کتنا بھیانک، کیسا مکروہ! نہیں یہ ہمارا بلدیو سنگھ ہو نہیں سکتا!

دونوں پاؤں کو جیسے کسی نے مکئی کے ڈنٹھل کی طرح پیٹ رکھا ہو۔ آڑے ترچھے بنے ہوئے! کہیں سے عجیب سا پھولا ہوا، کہیں سے خون بہتا ہوا! بہتا ہوا کہاں؟ بہاؤ تو کب کا بند ہو چکا تھا، اب تو صرف خون کے دھبے جیسے تھے، جن پر مکھیاں بھنک رہی تھیں! نہیں یہ ہمارا بلدیو سنگھ نہیں ہو سکتا!

بلد یو سنگھ کی ایسی حالت؟
جس جسم کو دیکھ دیکھ کے آنکھیں نہیں تھکتی تھیں —— مائیں جسے دیکھ کے کہتیں —— میرا بیٹا ایسا ہی جسم پائے۔" دوشیزائیں دل ہی دل میں سوچتیں —— "خوش نصیب ہے وہ عورت جسے ایسا ہی پتی ملے اگلے جنم میں، ہے بھگوان، مجھے بلدیو سنگھ کی ہی داسی بنانا۔" بوڑھے دیکھتے ہی کہتے: —— "بیٹا سلامت رہو!" نوجوان، جس پر پاگل ہو کر، بن داموں غلام بنے پیچھے لگے رہتے —— وہی جسم آج میرے سامنے پڑا ہے۔ خون میں لت، دھول سے اٹا، جوڑ جوڑ بدنما۔ بے ترتیب —— اور جس پر یہ کمبخت مکھیاں بھنک رہی ہیں۔

کس نے گت بنائی اس شیر دل کی ایسی؟ کس کی ماں نے دوسرا شیر پیدا کیا؟

کاش کسی شیر نے یہ حالت کی ہوتی! دو شیر لڑتے ہیں، ایک گرتا ہے، ایسا ہی ہوتا ہے، اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟ بلدیو سنگھ تو ایسی ہی موت چاہتے تھے۔ انھوں نے موت کی کب پروا کی؟ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا —— یہی تو بلدیو سنگھ تھے۔ چھتری کی طرح میدان جنگ میں کام آؤں، کھیت رہوں —— یہی تو ان کی تمنا تھی۔ یہ آرزو پوری ہوئی، وہ بہادروں کی طرح، نظامِ شمسی کو چھید کے جہانِ لافانی کو سدھارے، اس میں تو کوئی شک نہیں، لیکن جن ہاتھوں نے یہ کام کیا، وہ کیا کسی بہادر کے ہاتھ تھے، شیر کے پنجے تھے؟

نہیں، نہیں، چند گیدڑوں نے —— بزدلوں نے اور نامردوں نے —— چھپ کے، گھات لگا کے، بڑے بُرے موقع پر، بڑے بُرے ڈھنگ سے یہ ذلیل حرکت کی۔ اس کا تصور بھی خون کو کھولا دیتا ہے، چراغ پا کر دیتا ہے۔ اُف!

ایک دن جوار کے ایک گاؤں کی ایک بیوہ میرے گاؤں میں بلدیو سنگھ کا نام پوچھتی آئی! اس بیچاری کے ساتھ ایک بچہ تھا۔ اسی کا بچہ۔ اس بیوہ کی بے پناہی اور چھتری بچے کی کم سنی کا ناجائز فائدہ اٹھا کے، اس کے پٹی داروں نے اس کی جائداد ہڑپ لی تھی۔ بیوہ کے کانوں تک بلدیو سنگھ کے اوصاف کی کہانیاں پہنچی تھیں۔ وہ اب تو ہمارے جوار کے گھر گھر میں، زبان زبان پر جاری تھیں۔ بیوہ پہنچی، بلدیو سنگھ کے دربار میں فریاد کرنے۔ جب پٹی داروں کو معلوم ہوا کہ وہ بلدیو سنگھ کے پاس جا رہی ہے تو طعنے دیتے ہوئے بولے تھے —— جا، نیا شوہر بلالا! نیا شوہر! چھترانی کا نیا شوہر؟ —— "بابو، میری لاج رکھو!" ساری کہانی کہتی ہوئی، وہ بلدیو سنگھ کے قدموں پر گر پڑی۔ بلدیو نے بچے کو کندھے پر اٹھایا اور چل پڑے اُس گاؤں کو!

جب وہ گاؤں جا رہے تھے، میں نے انھیں دیکھا تھا۔ "پرنام بھائی جی!" —— میں نے کہا۔ ان کے چہرے پر غصے کے علامات نمایاں تھے، لیکن فطری ہنسی ہنستے ہوئے، آشیرواد دیا اور کہا —— ایک بے پناہ کی حفاظت کو جا رہا ہوں ببُوا، دو چار دنوں میں لوٹتا ہوں۔

بلدیو سنگھ نہیں لوٹے۔ لوٹی ہے اُن کی لاش!

وہاں پہنچتے ہی انھوں نے پٹی داروں کو چیلنج دے دیا۔ دوسرے دن بیوہ سے چھینے ہوئے ایک کھیت پر ہل بھی چڑھا دیا۔ کوئی نہیں بولا۔ بولتا کون؟ ایک کے بعد دوسرے، کھیت بیوہ کے قبضے میں آنے لگے، بہت دنوں کی ہاتھ سے نکلی ہوئی امرائی پر اب اس کا قبضہ تھا۔ اس باغ میں ایک لیچی کی شاخ میں جھولا ڈال کے اس چھتری کمار کو بلدیو سنگھ جھلاتے رہتے۔ جو لوگ پٹی داروں کے ڈر سے کل تک بولتے نہیں تھے؟ اب وہی بلدیو سنگھ کو شاباشی دیتے، اس ننھے بچے سے اپنا پرانا ناتا جوڑتے، کیونکہ اب وہ بیوہ بے پناہ نہیں رہی تھی۔ باپ کھو کے اس بچے نے ایک 'دھرم پتا' پا لیا تھا!

بلدیو سنگھ کے ساتھ ان کے چند شاگرد بھی گئے تھے۔ جب معاملہ پوری طرح سر د پڑ چلا تو اس گاؤں کے دوسرے لوگ بھی، کافی تعداد میں ان کے حامی بن گئے۔ تب انھوں نے ایک ایک کر کے، اپنے شاگردوں کو وہاں سے واپس کر دیا۔ بیچاری بیوہ پر زیادہ خرچ کا بوجھ کیوں ڈالیں؟ آخر ش ایک دن یہ فیصلہ کیا۔ "اب کل میں بھی چلا جاؤں گا۔"

اور وہ 'کل'، کبھی نہیں دیکھ سکے!

ان کی عادت تھی، بہت سویرے، بالکل منہ اندھیرے، وہ رفع حاجت کو جاتے۔ گاؤں سے کافی دور نکل جاتے۔ جب تک تناؤ تھا۔ کسی شاگرد کو بھی لے لیتے۔ ہتھیار تو ہمیشہ پاس رکھتے ہی ——— کم سے کم ہاتھ میں لاٹھی۔ کمر میں گرڑاسے کی پھلی جسے بات کی بات میں لاٹھی میں لگا کے

نمونۂ قیامت بن سکتے تھے۔ لیکن اس دن مطمئن ہو کے، صرف لوٹا ہاتھ میں
لئے نکل پڑے۔ سارا گاؤں صبح کی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ لیکن ان کے لئے
موت کا پھندا بچھایا جا چکا تھا۔

ایک نیچی کھائی میں رفع حاجت کے لئے بیٹھے ہی تھے کہ ان کے
سر پر لاٹھی کا ایک شدید وار ہوا۔ لمحہ بھر کے لئے وہ بیہوش سے ہو گئے
پھر فوراً کھڑے ہوئے اور سامنے پڑے لوٹے کو ہاتھ میں اٹھا کے،
اسی سے ڈھال کا کام لینے لگے۔ دوسری لاٹھی —— لوٹے پر ٹن سی
بجی۔ تیسری لاٹھی —— پھول کلنسے کا وہ لوٹا چور چور ہو گیا۔ پھر کیا تھا
لاٹھی، گنڈاسے، برچھے —— چاروں طرف سے برسنے لگے۔ ایک بار
پھاند کے اس نرغے سے نکلنے کی کوشش کی، لیکن پھر گھر گئے۔ گھیر لئے
گئے۔ اور آہ، اس سنّاٹے کے عالم میں، جب دنیا صبح کی سکھ نیند
سو رہی تھی، اُن بزدلوں، گیدڑوں، نے اس شیر دل کی ایسی دُرگت
بنائی، جو ہم یہ سامنے دیکھ رہے ہیں!

ایک صبح تھی، جب میں نے بلدیو سنگھ کا وہ روپ دیکھا تھا ——
تاباں، زندہ، پُرشباب! اور آج بھی ایک صبح ہے، جب ہم انھیں
اس شکل میں دیکھ رہے ہیں!

اُف! آہ!!

سرجو بھیّا

سرجو میّا نہیں، سرجو بھیّا۔ یہ ہمارے گاؤں کی خصوصیت ہے کہ کبھی کبھی مرد، گنگا، جمنا، یا سرجو، ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں عورتیں ہی خوش قسمت ہیں، عموماً ان کے ناموں میں ایسی ستم ظریفیاں نہیں ہوتیں۔

ہاں تو سرجو بھیّا! میرے گھر سے ملا ہوا جو ایک گھر ہے ——— ایک طرف دو کھپریل مکان، ایک طرف مٹّی کی دیوار پر پھوس کا چھپّر، ایک طرف ٹٹّی کے دو جھونپڑے، ایک طرف مکان ندارد، صرف ٹٹّی کو کھڑا کر کے چھوٹا آنگن نکالا ہے ——— اسی گھر کے، خوش نصیب، مالک ہیں ہمارے سرجو بھیّا۔

سرجو بھیّا کا کوئی چھوٹا بھائی نہیں رہا، اور میں نے پہلی اولاد کی حیثیت میں ہی اپنی ماں کی گود بھری، اس لئے، ہم دونوں نے آپس میں ایک رشتہ جوڑ لیا ہے۔ وہ میرے بڑے بھائی ہیں اور میں ان کا چھوٹا بھائی۔

گاؤں کے سب سے لمبے اور دُبلے آدمیوں میں، سرجو بھیّا کی گنتی ہو سکتی ہے رنگ سانولا، بگلے جیسی لمبی لمبی ٹانگیں، شمپانزی کی طرح لمبے لمبے ہاتھ، کمر میں دھوتی باندھے، کندھے پر انگوچھا ڈالے، جب وہ کھڑے ہوتے ہیں، آپ ان کی پسلیوں کی ہڈیاں گن سکتے ہیں، ناک کھڑی، لمبی گھنی بھویں۔ بڑی بڑی آنکھیں جلقوں میں دھنسی، گال پچکے، عضو عضو کی رگیں اُبھری - کبھی کبھی معلوم ہوتا، یہ رگیں نہیں، ان کے جسم کو کسی نے پتلی ڈوریوں سے جکڑ رکھا ہے۔

مندرجہ بالا تصویر، بلاشبہ کسی فاقہ زدہ مُردہ دل انسان کی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کیا حقیقت بھی ایسی ہے؟ سرجو بھیّا میرے گاؤں کے چند زندہ دل لوگوں میں سے ایک ہیں، بڑے ملنسار، پُر مذاق اور ہنسوڑ۔ وہ جب دل کھول کر ہنستے ہیں تو ان کے چھوٹے چھوٹے دانتوں، پورے جسم میں جو سب سے چھوٹی چیز انھیں ملی ہے ——— کی قطاریں بے ساختہ چمک پڑتی ہیں، عضو عضو مرتعش ہو اٹھتا ہے ——— جیسے ہر عضو ہنس رہا ہو! اور سرجو بھیّا کے پاس اتنی جائداد ہے کہ وہ اپنا یا اپنے گھر والوں کا ہی پیٹ نہیں بھر سکتے مہمانوں کی خاطر تواضع بھی مزے میں کر سکتے ہیں۔

تو پھر یہ ہڈیوں کا ڈھانچہ کیوں؟ میں جواب میں ایک پُرانی کہاوت پیش کروں گا ——— قاضی جی دُبلے کیوں؟ ——— شہر کے اندیشے میں!"

ہاں، سرجو بھیا کی جو یہ حالت ہے، وہ اپنے لئے نہیں، دوسروں کے جلنے پرایوں کی بھلائی کے جلنے، انھوں نے نہ صرف اپنا جسم سکھا لیا ہے۔ بلکہ اپنی جائداد کو بھی کچھ کم برباد نہیں کیا ہے!

ان کے پتا، جو گماشتہ جی کہلاتے تھے۔ میرے گاؤں کے اچھے کسانوں میں تھے۔ کشادہ، صاف ستھرا اُن کا مکان اور اچھی خاصی بیٹھک تھی، جہاں آج سرجو بھیا کی یہ "رام مڑیا" ہے۔ کھیتی باڑی تو تھی ہی۔ ربیوں اور غلے کا اچھا لین دین بھی تھا۔ کنبہ بھی بڑا اور خرچیلا نہیں تھا۔ لیکن ان کے مرتے ہی، سرجو بھیا نے لین دین چوپٹ کیا، سیلاب نے کھیتی کو تباہ کی اور زلزلے نے گھر کا ستیاناس کیا۔ اُن کا لین دین اتنا اچھا تھا کہ وہ شاید کھیتی کو بھی سنبھال لیتے گھر بھی کھڑا کر لیتے۔ مگر، سرجو بھیا اور لین دین؟

لین دین جسے صاف لفظوں میں سود خواری کہئے، چاہتا ہے کہ انسان انسانیت کھو دے، وہ جونک یا کھٹمل، نہیں جوئیں بن جائے۔ سیاہ جونک اور لال کھٹمل کی تو اپنی آزاد حیثیت ہے۔ ہم ان کا خون چوسنا محسوس کرتے ہیں۔ ہم ان میں اپنا خون صاف نمایاں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن، جوئیں؟ گندے کپڑوں میں انھیں جیسا میلا کچیلا رنگ لئے، وہ چپ چاپ پڑی رہتی ہیں۔ ان کا اس طرح خون چوسنا ہم محسوس بھی نہیں کر پاتے اور اگر محسوس کرتے بھی ہیں تو ہلکی سی سہرن یا زیادہ سے زیادہ کچھ چنچنی، اور محسوس کر لینے پر بھی انھیں پکڑ پانے کے لئے تو کوئی خوردبین ہی چاہئے۔

سرجو بھیا جوں نہیں بن سکتے تھے۔ ان کے اس لمبے جسم میں جو دل ملا ہے، وہ جسم کی ہی مناسبت سے جو بھی دکھیا آیا، اپنی مصیبت سنائی، اسے دیوتا کی طرح دے دیا، اور وصولی کے وقت، جب وہ آنکھوں میں آنسو لاکے گڑگڑایا تو دیوتا ہی کی طرح پسیج بھی گئے۔ سود کون کہے، کچھ ہی دنوں میں اصل بھی صفر میں بدل گیا! اسلئے اب وہ خود ہتھ پھیر میں مصروف رہتے ہیں۔

سیلاب اور زلزلے نے ان کے کھیتوں اور گھر کو برباد کیا ضرور، لیکن، سرجو بھیّا' مجھے یقین ہے، آج کی اس زبوں حالی سے بہت کچھ بچے رہتے، اگر لین دین کے بعد بھی وہ ان دونوں کی طرف پورا دھیان دئے ہوتے۔ ایسی بات بھی نہیں کہ وہ کام چور یا کاہل اور بودے گرہست ہیں۔ نہیں ٹھیک اس کے برعکس —— چالاک، پھرتیلے اور باعمل آدمی ہیں۔ لیکن، کریں تو کیا؟ انھیں اوروں کے کام سے ہی فرصت کہاں ملتی ہے؟

گنگو بھائی کے یہاں بچّہ بیمار ہے، وید کو بلانے کون جائے گا؟ —— سرجو بھیّا! ہردے کو بازار سے کچھ سودا سلف منگانا ہے، وہ کسے بھیجے؟ سرجو بھیّا کو! خبر آئی ہے، رام کمار کے ماما جی اپنے گاؤں میں سخت بیمار ہیں، ان کی خیریت کون لائے؟ —— سرجو بھیّا سے بڑھ کر دوسرا کون قاصد ہوگا! پرمیسر کو ایک رجسٹری کرنی ہے، شناخت کون کرے گا؟ سرجو بھیّا! کسی کے گھر میں شادی بیاہ، اگیہ جاپ ہو۔ اور سرجو بھیّا پریشان حال۔ کسی کی موت ہو جانے پر، وہ اندھیری رات ہی کیوں نہ ہو، بلاشبہ کفن خریدنے کا ذمہ سرجو بھیّا کا ہوگا۔ اس طرح گاؤں بھر کا بوجھ اپنے سر لے کے سرجو بھیّا نے نہ صرف اپنے کھیت اور گھر کا ملیامیٹ کیا ہی بلکہ اسی عمر میں اپنی کمر بھی جھکا لی ہے۔ دن ہو یا رات، چلچلاتی دوپہر ہو یا اندھیری رات، سرجو بھیا کے خدمت خانے کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے، وکٹر ہیگو نے اپنی زندہ جاوید تصنیف "بے مڑرے بے" میں کہا ہے —— ڈاکٹر کا دروازہ کبھی بند نہیں ہونا چاہیئے۔ اور پادری کا پھاٹک ہمیشہ کھلا رہنا

چاہئے۔ سرجو بھیّا کو بلاشبہ ان دونوں کا مرتبہ تنہا حاصل ہے۔

میرے ناچیز خیال میں، سرجو بھیّا کی شخصیت لائق پیروی و تتبع ہی نہیں قابلِ تعظیم اور لائق پرستش بھی ہے۔ جب بھی انھیں دیکھتا ہوں، میرا 'باعلم' سر، آپ سے آپ ان کے قدموں میں جھک جاتا ہے۔ لیکن میرے دل پر سب سے زبردست چوٹ تب لگتی ہے، جب دیکھتا ہوں، اس گوہر گرانمایہ کی قدر کہاں تک ہوگی، بہتیرے افراد انھیں سادہ لوح سمجھ کے ٹھگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر بات اتنی ہی ہوتی تو بھی قابلِ برداشت ہو سکتی تھی، لیکن یہی نہیں، انھیں اکثر جھنجھٹوں میں بھی ڈالنے کی کوشش ہوتی ہے اور اگر وہ اس جھنجھٹ میں پڑ جاتے ہیں، تو اس سے نکالنے کا کیا سوال، ان کے تڑپنے کا تماشا دیکھنے میں لوگ لطف محسوس کرتے ہیں۔

ابھی چند ہی دنوں کی بات ہے، ایک دن سرجو بھیّا میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ سر نیچا کئے ہی بولا۔ بیٹھئے بھیا لیکن بھیّا بیٹھیں گے کیا، ان کی تو گھگی بندھی ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ دوبارہ کہنے پر بھی جب وہ نہیں بیٹھے تو میں نے ان کی طرف نظر اٹھائی۔ ان کا چہرہ دیکھ کے دنگ رہ گیا۔ بھوچکا! کیا بات ہے یہ؟ بہت ڈھارس بندھانے اور التجا کرنے پر ان کی زبان ہلی۔ معلوم ہوا، ان کے گھر میں ایک معمولی سا واقعہ ہو گیا ہے، ایسے واقعات اپنے ہی گاؤں میں کئی بار ہوتے دیکھے گئے ہیں، لیکن کسی نے ان پر دھیان بھی نہیں دیا، اگر ضرورت ہوئی تو انھیں سلجھانے کی ہی کوشش کی گئی اور اگر کسی نے بڑھانا چاہا تو لوگوں

نے اسے ڈانٹ دیا۔ کیوں؟ کیونکہ وہ واقعات ایسے گھروں میں ہوتے تھے۔ جن کے پاس نہ صرف لکشمی (دولت) بلکہ دُرگا (طاقت) بھی تھی — پیسے بھی اور لاٹھی بھی۔ لیکن سرجو بھیّا نے تو ادروں کے لئے ہی اپنی یہ حالت کر رکھی تھی۔ نہ وہ کسی پر دولت کی دھونس جما سکتے ہیں۔ نہ ڈنڈا ہی سنبھال سکتے ہیں۔ پھر کیوں نہ انھیں تڑپایا جائے، رُلایا جائے؟ جب میں نے انھیں تشفی دلائی تو انھیں قرار آیا۔ وہ چلے گئے، لیکن، لوگوں کی اس احسان فراموشی نے مجھے تمام رات چین سے سونے نہ دیا۔

سیدھے پن کی بدولت ٹھگے جانے کی ایک کہانی ——— بہت دن ہوئے، مجھے ایک ضرورت آن پڑی اور کچھ روپیوں کے لئے میں پریشان تھا۔ سرجو بھیّا کے پاس کچھ روپے تھے۔ میری پریشانی اُن سے کیسے دیکھی جاتی؟ وہ روپے لے آئے۔ میں نے خرچ کر دیا، لیکن آج تک دے نہیں سکا۔ روپے تو آئے، لیکن ایک آیا دو کا خرچ لے کے۔ سرجو بھیّا مانگنے کا حال کیا جانیں؟ میں بھی سمجھتا رہا، ان کے رُپے کہاں جاتے ہیں، ضرورت ہوگی، مانگیں گے تو دے دوں گا۔ لیکن ابھی اُس دن، جو بات انھوں نے بتائی، میں ہکّا بکّا رہ گیا۔

اس درمیان انھیں روپیوں کی ضرورت ہوئی، لیکن جھجک کے سبب مجھ سے نہیں مانگا۔ ایک سود خوار مہاجن کے پاس گئے، جو پہلے انھیں سے قرض لیا کرتا تھا، لیکن طرح طرح کے داؤ پیچ کر کے اب دھنّا سیٹھ بن چکا ہے۔ اس نے فوراً انھیں روپے دے دئے۔ لیکن جب چلنے لگے تو کہا

آپ کے یہاں سے روپے جائیں گے کہاں۔ لیکن کوئی ثبوت تو چاہئے ہی! ——

کیا ثبوت؟ تیار ہوں! —— سرجو بھیا روپے باندھ چکے تھے، ان سے نہ تو اب کھول کے لوٹایا جا سکتا تھا نہ وہ اس کے مطالبے کو رد کر سکتے تھے ——

نہیں کچھ نہیں، کاغذ پر صرف نشان لگا دیجئے، آپ سے باضابطہ ہینڈنوٹ کیا لکھایا جائے؟ اور سرجو بھیا نے 'دیم بھولا، کی طرح، کجلوٹے ہیں، انگوٹھا ڈال کے، کاغذ پر چپکا دیا۔ گویا کسی جدید انٹونیو نے کسی کلجگی شائیلاک کے ہاتھوں اپنے کو رہن رکھ دیا۔

اب وہ کہتا ہے —— جلدی روپے ادا کر دو، ورنہ میں نالش کر دوں گا اور دعویٰ بھی کتنے کا کرے گا، کون ٹھکانا —— سرجو بھیا بیچارگی میں بول رہے تھے، اور میں ان کا منہ حیرت سے تک رہا تھا۔ آپ نے ایسی غلطی کیوں کی؟ —— لیکن وہ اس کا جواب سوائے اس کے اور کیا دے سکتے تھے کہ کیا کرتا، روپے باندھ جو چکا تھا!

سرجو بھیا کو پانچ اولادیں ہوئیں، لیکن بیٹیاں ہی بیٹیاں۔ ان کی دھرم پتنی جو لمبائی میں بالکل ان کے برعکس، بہت ہی ناٹی ہونے پر بھی، بہتیری صنعتوں میں ان کی ہی طرح ماہر تھیں، حال ہی میں بیٹے کا ارمان لئے چل بسیں۔ کہہ نہیں سکتا اس ارمان نے سرجو بھیا کو زیادہ متفکر بنا رکھا تھا یا نہیں۔ وہ بیٹوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں اور میرے گھر میں جو لڑکے —— میرے بیٹے اور بھتیجے ہیں، ان کے بچپن تو زیادہ تر، انہیں کے کندھوں پر بیتے ہیں، بیٹیاں تو اپنی اپنی سسرالوں میں جا بسیں گی۔ کیا سرجو بھیا کا یہ آبائی

مکان کھنڈر بنے گا؟ کیا سرجو بھیا کی کوئی نشانی ہمارے پڑوس کو گل زار نہ کرسکے گی۔
اس کے تصوّر سے ہی ہمارے گھر بھر پر ایک عجیب اداسی چھا جاتی ہے۔ اُنکی پتنی کی موت کے بعد، میں نے اپنی موسی کو کہتے سُنا ——— سرجو بُوا کی ابھی عمر ہی کیا ہے؟ یہی، میرے بُوا سے چار برس بڑے ہیں، وہ پھر دوسری شادی کیوں نہیں کرتے، کیا بنس ڈبو دیں گے؟ اور، اس دن دیکھا، میری ڈھیٹ رانی سرجو بھیا سے جھگڑ رہی ہے ——— نہیں، آپ کو شادی تو کرنی ہوگی؟ ——— میں شادی کروں، تاکہ شرما جی کو (مجھے) نئی بھاوج سے چہلیں کرنے کا لُطف حاصل ہو، کیوں؟
مجھے دیکھتے ہی سرجو بھیا بولے اور کھلکھلا کے ہنس پڑے۔ رانی کچھ سٹپٹائی، پھر ہنس پڑی، میں دونوں کو دیکھتا اور چپکے چپکے مُسکراتا رہا!

منگر

ہٹا کٹا جسم، کمر میں بھگوا، کندھے پر ہل، ہاتھ میں ڈنڈا، آگے آگے بیلوں کی جوڑی، اپنی آواز کی چھاس، سے ہی بیلوں کو ہانکتا، وہ میرے کھیت کی طرف صبح ہی جاتا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا، منگر کو اسی روپ میں دیکھا ہے۔ مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔

ہاں مجھے یاد آتا ہے، کبھی کبھی ہل کے بدلے مجھے بھی اس کے کندھوں پر چڑھنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا لیکن ایسے موقعے بہت کم آتے ہیں۔ کیونکہ نہ جانے کیوں، منگر کو بچوں سے وہ فطری محبت نہیں، جو اس جیسے افراد میں عموماً پائی جاتی ہے۔ اُسے دیکھ کے بچے بھاگتے ہی رہے ہیں۔ اور آج جب منگر نحیف اور ضعیف ہو چکا ہے، بچے، گویا اُس سے بدلا چکانے کو، اپنی چھوٹی چھڑیوں سے اُسے چھیڑ کے بھاگتے ہیں۔ اور جب وہ جھلاتا، انھیں مارنے کے لئے اپنی

بڑھاپے کی لاٹھی ڈھونڈتا۔ یا بھنّا کے گالیاں بکنے لگتا ہے، تو وہ کھلکھلا اٹھتے ہیں اور اس کا منہ چڑانے لگتے ہیں۔

اسے بچوں سے یہ غیر دلچسپی کیوں ہوئی؟ شاید اس لئے تو نہیں کہ اُسے جو ایک بچہ نصیب ہوا، وہ کمانے والی اولاد بننے سے پہلے ہی، اسے دغا دے کے چل بسا اور اس کی جو ایک بچی زندہ بھی رہی تو لولی ہو کر، اور جس کی شادی میں اس نے کافی دریا دلی دکھائی تھی۔ لیکن ایک بار مصیبت کا مارا اس کے دروازے پر وہ پہنچا تو داماد نے ایسی بے رُخی دکھائی کہ منگر کی خودداری اُسے زبردستی وہاں سے بھگا لائی۔

منگر کی خودداری! غریبوں میں بھی خودداری؟ لیکن منگر کی خوبی یہ بھی رہی ہے۔ منگر نے کسی کی بات کبھی برداشت نہیں کی اور شاید اپنے سے بڑا کسی کو، دِل سے 'مانا بھی نہیں۔ منگر میرے دادا کا ادب کرتا تھا، شاید ان کے بوڑھاپے کی وجہ سے —— سُنا ہے، یہ میرے پتاجی کو بہت مانتا تھا۔ —— شاید ان کی نیک مزاجی کے سبب۔ لیکن میرے چچاؤں کو تو اس نے ہمیشہ برابری کا ہی سمجھا اور مجھے تو وہ کل تک 'ننو' کہہ کے ہی پکارتا رہا تھا۔ کسی کی مجال کہ منگر کو بدزبان کہے۔ ہالیوں کو روزانہ ملنے والی گالیاں تو دور کی بات رہی!

ایسا کیوں؟ اس کی خاص وجہ منگر کا یہ ہٹا کٹا جسم اور اس سے بھی زیادہ اس کی جفاکشی تھی جس میں ایمانداری نے چار چاند لگا دئے تھے۔ جتنی دیر میں اوروں کے ہل دس کٹھا کھیت جوتتے، منگر پندرہ کٹھا جوت لیتا اور وہ

بھی اِتنا باریک جوتتا کہ پہلی 'چاس' میں ہی 'سیراؤ' ملنا مشکل ہوتا۔ منگر کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ کس دن کس کھیت میں ہل جائے گا۔ وہ شام کو ہی ہر ایک کھیت کی 'آل آل' گھوم آتا اور جس میں ضرورت دیکھتا اسی میں ہل دوسری صبح کو لے جاتا۔ جوتائی کے وقت کسی کی نگرانی بھی ضروری نہیں ہوتی۔ عام ہالیوں کے پیچھے پیچھے جس طرح کسان لٹھ لئے پھرتے ہیں، پھر بھی وہ جی چراتے، کام میں ڈھیلائی کرتے، آج کا کام کل پر چھوڑ دیتے، اس کی عادت منگر میں تھی ہی نہیں۔ اسی طرح، رکھوالی چاہے ہری فصل کی ہو یا خشک کی کھلیان میں بوجھوں کے انبار کی ہو یا غلّے کے ڈھیر کی —— منگر پر سب کچھ چھوڑ کے مطمئن سویا جا سکتا تھا۔

ایسا دوسرا آدمی ملتا کہاں؟ پھر کیوں نہ اس کی قدر کی جاتی؟ میرے دادا کہتے تھے، منگر ہالی نہیں، گھر کا 'سوانگ' ہے۔ وہ اپنے 'سوانگ' کی طرح ہی کبھی کبھی روٹھ بھی جاتا اور اکثر لوگوں کو جھڑک بھی دیتا تھا۔ اس کی جھڑکیاں سب کے سر آنکھوں پر، یہ روٹھا نہیں کہ منایا جانے لگتا کبھی کبھی باتیں کچھ بڑھ بھی جاتیں۔ ایک دن کافی کہا سنی ہو گئی۔ دوسرے صبح منگر ہل لینے نہیں آیا —— ادھر سے بلاوا بھی نہیں گیا۔ روپے ہیں تو کیا ہالی نہیں ملیں گے؟ کوئی نیا ہالی بلوا کر کھیت جتوائے گئے۔ اُدھر کوتی دوسرا کسان جا کے منگر سے بولا —— "منگرو، دیکھ انھوں نے دوسرا ہالی رکھ لیا ہے، ان کے پاس روپے ہیں، ہزاروں ہالی ملیں گے، تو تیرے پاس بھی ہاتھ پاؤں ہیں، تجھے بھی ہزاروں گرہست ملیں گے۔

چل میرا کھیت جوت، جو تو کہے گا، مزدوری دوں گا۔" لیکن میرے سر میں درد ہے۔" منگر نے جواب دیا۔ اور اس کا یہ درد سر تب تک موجود رہا جب تک میرے چاچا جی جھک مار کر، پھر اسے بلانے نہیں گئے۔ کیوں کہ چار ہی دنوں میں معلوم ہو گیا، منگر کیا ہے! بیلوں کے کندھے چھل گئے۔ ان کے پاوؤں میں ہل کی نوک لگ گئی۔ کھیت میں ہل تو چلا، نہ ڈھیلا ٹوٹا، نہ مٹی ملی پھر کھیت کی آل پر بیٹھے تمام دن ہالیوں کو ٹھوکے دیتے رہنا پڑا، تب کہیں دس کٹھا زمین جُت پائی۔ منگر کے بغیر کام چل نہیں سکتا۔

چاچا جی اس کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ منگر گھر میں بیٹھا ہے۔ منگر کی عورت، بھکولیا نے کہا۔ مالک کھڑے ہیں، جاؤ، مان جاؤ۔ کہہ دے میرے سر میں درد ہے۔ منگر نے چاچا جی کو سنا کے کہا۔ مالک ذرا ان کے سر پر مالکن سے تیل ڈلوا دیجیے گا۔ بھکولیا ہنستی ہوئی بولی۔ تو مجھ سے دل لگی کرتی ہے ——— منگر کے لہجے میں ناراضگی تھی۔ منگرو، چلو، آپس میں کبھی کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ معاف کر دو! چاچا جی کے لہجے میں التجا تھی۔ جائیے اسی سے جتوائیے جس سے چار دن جتوایا ہے! مجھے لے جا کے کیا کیجیے گا آدھی روٹی کی بچت بھی تو ہو گی! ——— یونہی نوک جھونک، آرزو منت۔ پھر منگر اپنا ہالی کا ڈنڈا ہاتھ میں لیے آگے آگے اور چاچا جی پیچھے پیچھے!

یہ آدھی روٹی کی بچت کیا؟ اسے سمجھا آپ نے؟ اسے منگر کا خاص اجارہ سمجھیے۔ جہاں گاؤں بھر میں ہالیوں کو ایک روٹی ملتی، وہاں منگر کے لیے

ڈیڑھ روٹی جاتی۔ وہ بھی روٹی اچھی ہو اور ٹھیک سے سینکی ہوئی۔ اس پر کوئی سبزی بھی ضرور ہو۔ کیونکہ منگر کسی کا کچا نمک' نہیں کھاتا! منگر کی تمام شرطیں پوری ہوتیں!

لیکن یہ ڈیڑھ روٹیاں وہ خود کھاتا، ایسا، آپ نہ سمجھیں۔ کیا اپنی رفیقۂ حیات کے لئے لے جاتا؟ نہیں! آدھی روٹی دو ٹکڑے کر کے دونوں بیلوں کو کھلا دیتا۔ یوں یہ آدھی روٹی پھر ہمارے ہی گھر لوٹ آتی۔ لیکن اس میں کسی طرح کی کاٹ چھانٹ ہو نہیں سکتی تھی۔ 'مہادیو' (بیل) منہ تاکیں اور میں کھاؤں۔ یہ کیسے ہو گا؟ منگر کے لئے یہ بیل نہیں، مجسم 'مہادیو' تھے۔

ایک آدھ بار بات بہت بڑھ گئی تو منگر ہمارا گاؤں چھوڑ کے چلا گیا لیکن گاؤں میں رہتے اُس نے دوسروں کے ہل نہیں پکڑے' دوسرے گاؤں میں بھی وہ جم نہ سکا تب تیسرا گاؤں دیکھا، اور آخر میں مارا مارا پھر گاؤں میں واپس آیا۔ شاید ہمارے جیسا قدر دان گھر اُسے اور کہیں نہیں ملا!

منگر کا مزاج روکھا اور بے لوث رہا ہے، کسی سے للّو چپّو نہیں، لاگ لپیٹ نہیں،" دو ٹوک باتیں جو ٹوک برتاؤ۔" پھر بھی نہ جانے کیوں، منگر مجھے شروع سے ہی محبّت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا ہے۔ شاید اسی لئے کہ میرے پتا جی اسے بہت مانتے تھے۔ اب بھی کہتا ہے ——— مالک تھے میرے منجھلے بابو، وہ مرے، میری تقدیر پھوٹی! اور شاید اس لئے بھی کہ میں بچپن سے ہی یتیم ہوں۔ ماں مر گئی، پتا جی چل بسے، جب ہی تو اس نے اپنا پاکیزہ کندھا وقف کر دیا! اور جب میں کچھ بڑا ہوا تو نانیہال جانے

آنے اور رہنے لگا۔ یاد آتا ہے، منگر ہی مجھے وہاں پہنچاتا۔ میں ایک ٹھناٹو گھوڑی پر سوار، منگر سر پر سوغات کی چیزیں اور کتابیں لئے، گھوڑی کی لگام پکڑے آگے آگے۔ جہاں کہیں زمین اونچی نیچی ہوتی، میری بغل میں ہاتھ ڈال کے مجھے بھی پکڑ لیتا، تاکہ میں گر نہ جاؤں، اس کے مضبوط ہاتھوں کے اس لطیف لمس کو آج بھی محسوس کرتا ہوں۔

میں جیوں جیوں بڑا ہوتا گیا، گھر سے میرا تعلق ٹوٹتا گیا۔ بقول منگر، میں تو اپنے ہی گھر کے لئے مہمان بن گیا۔ لیکن جب جب دو چار دنوں کے لئے گھر آیا، منگر کو اسی روپ اور اسی پیشے میں منہمک پایا۔

کپڑوں سے منگر کو وحشت رہی ہے۔ ہمیشہ کمر میں لنگوٹی ہی لپیٹے رہتا ہے۔ دھوتیاں ملا کی ہیں۔ گوردھن پوجا کے دن، ہر سال ایک نئی دھوتی لئے بغیر وہ بیلوں کی سینگوں میں، لٹکن، باندھتا تھوڑا ہی؟ یوں بھی دادا اور چاچا سال میں جب تب پرانی دھوتیاں دیا کرتے۔ گھر میں شادی بیاہ کے موقعوں پر اُسے لال دھوتیاں بھی ملی ہیں۔ میری شادی میں منگر کے لئے نیا کرتا بھی بنا تھا۔ لیکن، دھوتیاں ہمیشہ اس کے سر کا ہی سنگار رہیں۔ جنھیں وہ پگڑی کی طرح لپیٹے رہتا۔ اور کرتا جب وہ میری کسی برادری میں سندیش لے کے جاتا، تب ہی اس کا جسم ڈھنکتا۔ ویسے عموماً وہ ہمیشہ ننگ دھڑنگ ہی رہتا۔ اور میں کہوں، مجھے اس کا جسم، اس روپ میں، بہت ہی اچھا لگتا۔ آج ایک فنکار کے نقطۂ نظر سے کہتا ہوں، منگر کو خوب صورت جسم ملا تھا۔

کالا کلوٹا ——— پھر بھی خوب صورت؟ حُسن کو رنگ آمیزی اور نقاشی کا مجموعہ سمجھنے والوں کے رجحان کو میں نہیں سمجھ پاتا۔ یہ کہنے کی گستاخی کے لئے

آج بھی یہ معافی مانگنے کو تیار نہیں۔ منگر کا وہ کالا کلوٹا جسم —— ایک مکمل، نمونۂ رفتہ انسانی تپلے کا بہترین نمونہ تھا۔ لگاتار محنت نے اس کے پٹھوں کو فطری طور پر ابھار رکھا تھا —— پہلوانوں کی طرح، اُن میں غیر فطری ابھار نہیں آیا تھا۔ رانیں، سینہ، بازو، سب میں جہاں جتنی، جیسی گٹھن اور اُبھار چاہیئے، بس اُتنا ہی۔ نہ کہیں گوشت کا لوندا، نہ کہیں خشک لکڑی۔ ایک سڈول جسم پر فطری طور پر رکھا ہوا ایک مناسب سر، منگر کے اعضا کا خیال آتے ہی مجھے فطری ورزش کے حمائتی، مسٹر مولر کی جسمانی ساخت یاد آجاتی ہے۔ سینڈو کے شیدائی اس سے کچھ مایوس ہوں تو تعجب نہیں۔ لیکن آج نہ تو وہ محفل رہی اور نہ وہ شمعِ محفل۔ منگر وہ نہیں رہا، جو کبھی تھا۔ وہ اپنے اکھڑپن سے ہمیشہ دھتا بتاتا رہا۔ لیکن عمر کے حملوں سے وہ اپنے کو بچا نہیں سکا۔ اس کی ایک ایک چوٹ اسے رفتہ رفتہ نحیف بناتی رہی۔ اور آج اس پر یہ کہاوت صادق آتی ہے —— "سوکھی ہڈی، ٹھاٹھ بھئی بھاری۔ اب کالا دب ہے بیوپاری!"

اس کے جسم کے گوشت اور پٹھے ہی نہیں گل گئے ہیں، اس کی ہڈیاں تک سوکھ گئی ہیں۔ آج کا اس کا یہ جسم، اس پرانے جسم کا کارٹون بن گیا ہے۔ بڑھاپے کی چوٹوں کے لئے جو ڈھال کا کام کرتی، وہ چیز منگر نے کبھی جمع کی ہی نہیں: "آج کھائے، کل کو چھکّے۔ تاکو گورکھ سنگ نہ رکھّے" —— کا معتقد یہ منگر جمع کرنے کا دشمن رہا —— کوئی اولاد بھی نہیں رہی، جو بڑھاپے میں اس کی لاٹھی بنتی۔ عمر نے اس نہتے، بے زرہ بوڑھے پر وہ سب ہی تیر برسائے جو اس کے ترکش میں تھے! منگر بڑھاپے کے

سبب جب ہل چلانے کے لائق نہیں رہ گیا، تو چند دنوں تک اس سے کچھ ادھر اُدھر کے کام لئے گئے۔ لیکن زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ اب ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا، اُسے "پنشن" ملے ——— لیکن ہلواہوں ——— یعنی اُن داتاؤں ——— کے لئے 'پنشن' کا انتظام ہمارے بدقسمت ملک میں کہاں ہے! اور انفرادی ترحم کا دائرہ تو ہمیشہ ہی تنگ رہا ہے۔ پھر منگر میں جلی ہوئی رسّی کی وہ اینٹھن ——— اور شاید گرمی بھی ——— ہے جس سے ابرِ کرم سدا ہی اس سے دور دور بھاگتا رہا ہے۔ ابرِ کرم چاہتا ہے "تشکر" کی ٹھنڈی فضا، اور منگر کے لغت میں اس کو معدوم ہی سمجھیے۔ اس کے بدلے آج بھی بے لوث باتیں، جھڑپ، جھڑکیوں کی آنچ، جو پانی کو کون کہے، خون کو بھی سکھا دے اس کے باوجود، فراخ دلی کے شبنمی قطرے کبھی ٹپکے، لیکن پپیہے کی پیاس اس سے بھلے ہی بجھے، منگر کے بڑھاپے کا ریگستان اس سے سینچا نہیں جا سکتا۔ یہ دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آج ہم منگر کی ہڈیوں کا یہ ڈھانچہ بھی نہیں پاتے، اگر اس کی رفیقۂ حیات نہیں ہوتی۔

اس کی رفیقۂ حیات ——— بھکولیا! منگر کی آدرش جوڑی، وہی جھنبیا رنگ ——— کالی کہہ کے میں اس کی توہین کیوں کروں! دو ہی بچے ہوئے، اس لئے وہ انسانیت کے اُس "انحطاطِ عظیم" سے بچی رہی، جو 'مادریت' کا خوب صورت نام پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے، منگر ضعیف و ناتواں ہو گیا، مگر بھکولیا ابھی بھی خلیتی پھرتی ہے، ہاتھ پاؤں چلا کے کچھ

اکٹھا کر لیتی ہے اور دونوں کی گزر بسر کا انتظام کر پاتی ہے۔ لیکن یہ بھی کب تک؟ وہ بیچاری بھی تو دن بدن فرسودہ ہوتی جاتی ہے!

بھکولیا ——— منگر کی آدرش جوڑی جسمانی ساخت میں ہی نہیں، مزاج میں بھی۔ وہ بھی دن تھے جب وہ تمک کے بولتی، جھپٹ کے چلتی، نہ کسی کو جلدی منہ لگاتی اور نہ کسی کی باتیں برداشت کرتی جس کسی نے چھیڑا ا گویا اس نے سیاہ ناگن کے پھن پر پاؤں رکھ دیا۔ لیکن بھکولیا میں صرف پھنکار ہی پھنکار تھی، کاٹ اور زہر کا الزام لگانا اس کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔

لیکن مردوں کی نسبت عورتیں اپنے کو ماحول کے سانچے میں زیادہ آسانی سے اور جلد ڈھال سکتی ہیں۔ اس کی مثال یہ بھکولیا ہے۔

منگر آج بھی وہی منگر ہے ——— منہ کا ہلکا یا ہو ہر کہیے! لیکن بھکولیا وہی نہیں رہی۔ کسی کا بچہ کھلا دیا، کسی کی کٹائی پسائی کر دی، کسی کے اپلے تھاپ دیئے۔ کسی کا پانی بھر دیا اور اس سے جو کچھ ملا، اس میں پہلے منگر کو کھلا کے، پیچھے خود کھانے بیٹھتی۔ لیکن اتنا کرنے پر بھی وہ ہمیشہ منگر کی پھٹکار سنتی۔ منگر سارا غصہ اور دیرینہ جھڑکیاں اب زیادہ تر اسی پر صرف کرتا۔

"بھگوان کی رضی" کہہ کر منگر جس کے نام پر اپنی مصیبتوں کو بھول جانے کی کوشش کرتا رہا، اس بھگوان نے پچھلے سال اس کی اور بھی بری حالت کر دی۔ اسے زور کا دردِ شقیقہ ہوا۔ بھکولیا اس کی کراہ سے بے قرار ہو کے، کسی رحم دل سے دار چینی مانگ لائی اور اسے بکری کے دودھ میں پیس کے اس کی پیشانی پر لیپ چڑھا دیا۔ "بائیں پٹیری اور آنکھ پر بھی لگا دے" ——— منگر نے

لیپ کی ابتدائی ٹھنڈک محسوس کرتے ہوئے کہا ـــــــ بھکولیا اس کا حکم بجالائی
لیکن یہ کیا؟ جہاں جہاں لیپ لگا تھا، وہاں عجیب جلن شروع ہوئی، جلن زخم میں
بدلی اور زخم نے اس کی ایک آنکھ لے لی۔ جب میں گھر گیا ـــــــ بُواجی
میری ایک آنکھ چلی گئی، میں کانا ہو گیا۔ کہہ کے منگر رونے لگا۔ شاید میں نے پہلی
بار منگر کو روتے دیکھا۔ میں اس کی ڈھارس بندھا رہا تھا۔ لیکن میرا دل ......
مصیبت تنہا کیسے آئے؟

پچھلے ماگھ میں گھر پہنچا۔ سویرے دھوپ پھیل چکی تھی، لیکن میں، اپنی دیرینہ
عادت کے مطابق، آنکھیں بند کئے لحاف میں لپٹا پڑا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر
پر کچھ گرنے کی سی دُھم دھم' آواز آ رہی تھی۔ لحاف کو منہ سے ہٹا کے آنکھیں
کھولیں۔ دیکھا، سامنے 'پوال' کے انبار کے پاس، ایک کالا سا ہڈیوں کا ڈھیر
بار بار کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے اور گر جاتا ہے۔ یہ کیا؟ چونک کے اُٹھا۔
اس طرف بڑھا۔ یہ تو منگر ہے! سنا تھا، منگر کے نصف جسم کو فالج مار گیا ہے۔
دیکھتے ہی آنکھیں بھر آئیں۔ پاس جا کے اُسے سنبھالا اور کہا ـــــــ منگر پڑے
کیوں نہیں رہتے؟ تمھیں کتنی چوٹ آئی ہوگی؟

پڑے پڑے جی اکتا جاتا ہے بُواجی ـــــــ منگر نے جواب دیا۔

اُف! رگیں ڈھیلی پڑی ہیں، خون کا سوتا سوکھا ہوا۔ لیکن، گویا اب بھی
اس میں موجیں اُٹھتیں، اور کسی خشک سمندر کی طرح، ریتیلے کناروں پر سر ٹکرا کے
پچھاڑ کھا کے، گر پڑتی ہیں۔ کتنا الم ناک منظر!

روپا کی دادی

کچھ دن چڑھے، میں اسکول سے آکے، آنگن میں دو زانو بیٹھا چوڑا دہی کے نوالے پر نوالے نگل رہا تھا کہ اچانک امی نے میری تھالی اٹھالی اور اسے کمرے میں لے گئیں۔ پیچھے پیچھے میں بھی متحیر ان کے ساتھ لگا تھا، وہ تھالی رکھ کے مجھ سے بولیں

"بس، یہیں کھا، باہر نہ نکلنا، روپا کی دادی آرہی ہیں، نظر لگائیں گی! سمجھے نا؟"

میں سمجھتا کیا خاک؟ ہاں، روپا کی دادی سے کون نہیں ڈرتا؟ کون بچہ ان کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کے سہم نہیں اٹھتا؟ وہ ڈائن ہیں —— گاؤں بھر میں یہ بات مشہور ہے جس کو چاہیں، جادو کی ایک پھونک میں مار سکتی ہیں۔ بچوں پر ان کی خاص نظر عنایت رہتی ہے۔ کتنے بچوں کو، ہنستے کھیلتے نونہالوں کو، ان کی یہ بڑی بڑی آنکھیں نگل چکی ہیں۔

بڑی بڑی آنکھیں!

روپا کی دادی کی شکل وصورت یہ ہے —— لمبی گوری، بھرا ہوا جسم، ہمیشہ سفید صاف شفاف کپڑے پہنے رہتیں۔ اُس سفید پوشاک کے حلقے میں ان کا چہرہ رعب برساتا۔ پھر ان کی وہ بڑی بڑی آنکھیں، ہلکی سی سرخی کی جھلک! پورے جسم کی ساخت مردوں جیسی، گویا دھوکے سے عورت ہوگئی ہوں جس گاؤں سے یہ آئی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ...... وہاں عورتوں کا ہی راج ہے۔ لوگوں نے ان کے سسر کو منع کیا، وہاں بیٹے کی شادی نہ کیجیے۔ لیکن وہ پورے اکھڑ تھے۔

—— ضد پکڑ لی، دیکھیں کیسی ہوتی ہے وہاں کی لڑکی!

روپا کی دادی بیاہ کے آئیں۔ ان کے آنے کے چند ہی دنوں بعد سسر جی چل بسے۔ کچھ ہی دن بعد روپا کے دادا بھی۔ ان دونوں کی موتیں کچھ عجیب ہوئیں۔ سسر جی دوپہر کو کھیت پر سے آئے، روپا کی دادی نے تھالی سجا کے ان کے سامنے رکھی۔ دو لقمے کھا پائے تھے کہ پیٹ میں جیسے کھونچا لگا، درد ہوا، کھانا چھوڑ کے اُٹھ گئے۔ شام ہوتے ہوتے اسی درد سے چل بسے۔ روپا کے دادا جی ایک بارات سے لوٹے، تھکے ماندے۔ نئی نویلی بیوی —— روپا کی دادی —— ہنس کے ایک گلاس پانی پینے کو دیا۔ پانی پیتے ہی سر دھمکا، بخار آیا اسی بخار سے تین دنوں کے اندر راہی عدم ہوئے۔

پہلے سانحے کے بعد سے سرگوشیاں شروع ہوگئیں تھیں۔ اس دوسرے حادثے نے بالکل ثابت کردیا —— روپا کی دادی ڈائن ہیں۔ دونوں کو جادو کے زور سے کھا گئیں۔

روپا کے پتا جی کی پیدائش دوسرے حادثے کے تین چار مہینے بعد ہوئی۔ روپا کی دادی کی گود بھری ——— آخر اس ڈائن نے اپنا خاندان بچا لیا۔

لوگوں نے کہنا شروع کیا۔ بیٹے کو اس ڈائن نے بڑے نازوں سے پالا اور بڑا کیا، اس کی شادی کی، دھوم دھام سے۔ لیکن کیسی ہے یہ چڑیل! شادی کو سال گلنے لگتے بیٹے کو بھی کھا گئی۔ جوان بیٹے کو! جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ کتنا حسین، گٹھیلا جوان تھا وہ! کشتی کھیل کے آیا، اس کے ہاتھ سے دودھ پیا، خون کے دست ہونے لگے! چند ہی گھنٹوں میں چل بسا۔ اس کی موت کے بعد اس روپا کی پیدائش ہوئی اور روپا ابھی زچہ خانہ میں ہی کیں کیں کر رہی تھی کہ اس کی ماں چل بسی! باپ رے، روپا کی دادی کتنی بڑی ڈائن ہے! ڈائن پہلے اپنے گھر کا ہی صفایا کرتی ہے!

جوان بیٹے کی موت کے بعد، روپا کی دادی میں عجیب تبدیلی آئی۔ آنکھیں ہمیشہ سرخ رہتیں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی آنسوؤں کی دھار بہہ نکلتی، ہونٹوں ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتی رہتیں۔ دونوں وقت اشنان کرکے، بھگوتی کا بنڈ لیپتیں، دھوپ دیتیں۔ بہت صاف کپڑے پہنتیں۔ جس جوان کو دیکھتیں، دیکھتی رہ جاتیں، جس بچے پر نظر ڈالتیں۔ گویا اسے آنکھوں سے پی جائیں گی۔ لوگوں نے شور مچایا ——— اب اس کا ڈائن پن بالکل ظاہر ہو گیا۔ دوڑو بھاگو، روپا کی دادی سے بچو!

روپا کی دادی سے بچو ——— لیکن بچو گے کیسے؟ تمام دن روپا کو گود لئے کندھے پر چڑھائے یا اس کی انگلی پکڑے یہ اس گلی سے اس گلی، اس گھر سے

اس گھر آتی جاتی رہتی ہیں! نہ کوئی برت چھوڑتی ہیں نہ ایک تیرتھ۔ اور ہر برت اور تیرتھ کے بعد گاؤں بھر کا چکر! تقریبوں میں بغیر بلائے حاضر! اُف یہ ڈائن کب مرے گی؟ کب گاؤں کو اس سے نجات ملے گی۔

دل ہی دل میں یہ منایا جاتا، لیکن روپا کی دادی سامنے آئیں نہیں کہ اُن کی خوشامدیں شروع ہوگئیں۔ کہیں ناراض نہ ہوجائیں۔ اپنے سُسر، بیٹے اور بہو کو کھاتے جسے دیر نہ لگی، وہ بھلا دوسروں کے بال بچوں پر کیوں رحم کھائے گی؟ عورتیں انہیں دیکھتے ہی کانپ اٹھتیں، لیکن جیوں ہی وہ ان کے سامنے آتیں دادی کہہ کے ان کی آؤ بھگت شروع ہوجاتی —— اس آسن پر بیٹھیے ذرا حُقّہ پی لیجیے، سپاری کھا لیجیے، یہ سوغات آیا ہے، ذرا چکھ لیجیے، وغیرہ وغیرہ۔ روپا کی دادی کچھ مدارا تیں تو قبول کرتیں، کچھ نہیں۔ ان کا انکار اصرار قبول نہیں کرتا۔ انکار! لوگوں کو لرزہ سا آجاتا، پھر کنبہ ہی ٹھہرا، اگر سال چھ مہینے میں کسی کو کچھ ہوا، تو سارا الزام روپا کی دادی کے سر!

کتنے اوجھے بلائے گئے۔ اس ڈائن کو سر کرنے کے لئے۔ ان کے بڑے بڑے دعوے ہوتے۔ ڈائن میرے سامنے آتے ہی ننگی ناچنے لگے گی، ڈائن کے کپڑوں میں خود بخود آگ بھڑک اٹھے گی، ڈائن خون تھوکنے لگے گی، ڈائن پاگل ہو کے آپ سے آپ بکنے لگے گی۔ اوجھے آئے، تانترک آئے، ٹونے ٹوٹکے ہوئے، ہتھیلی کے مرگھٹ کی لکڑی، اڑھل کے غیر موسمی پھول، الٹی سرسوں کا تیل، مینڈک کی کھال، شیر کے دانت —— کیا کیا نہ اکٹھے کئے گئے۔ ڈھول بجے، جھانجھ بجے، گیت ہوئے! دیوتا آئے، بھوت آئے، دیوی جی

آئیں! لیکن روپا کی دادی نہ تو پاگل ہوئیں، نہ ننگی ناچیں، نہ ان کے جسم میں پھپھولے پڑے۔ اوجھے گئے، تانترک گئے، یہ کہتے ہوئے ——— اُف، یہ بڑی گھاگھ ہے، بغیر کام روپ چھپائے گئے ہوئے اُس کا جادو ہٹایا نہیں جا سکتا۔ کئی اور اوجھے اس کے لئے رُپے بھی اینٹھتے گئے! لیکن روپا کی دادی جیسی کی تیسی رہیں۔

میں بڑا ہوا، لکھا پڑھا، جدید تعلیم نے بھوت پریت کا وہم ہٹایا۔ جادو ٹونے پر سے یقین ختم کیا۔ میں نے کہنا شروع کیا ——— یہ لغویات ہے۔ روپا کی دادی پر جھوٹی تہمت لگائی جاتی ہے! بیچاری کے گھر میں یکے بعد دیگرے اتفاقیہ موتیں ہوئیں۔ اس کا دماغ درست نہیں۔ آنکھوں کی سُرخی یا آنسو ڈائن پنے کے نہیں، اُس کی پُرغم حالت کے علامات ہیں۔ بچوں کو دیکھ کے، انھیں چمکار کے، نوجوانوں کو گھور کے، وہ اپنے جوان بچّے کو یاد کرتی یا اُسے بھولنے کی کوشش کرتی ہیں۔ پوجا پاٹھ سب اسی کے ردِّ عمل ہیں۔ دنیا میں بھوت کوئی شے نہیں۔ جادو ٹونا سب غلط چیزیں ہیں۔ لیکن میری بات کون سنتا ہے؟ ایک دن ماں میری ان باتوں سے پریشان ہو کے بولیں۔

ہاں، تمھیں کیا، تمھارے لئے یقیناً جادو ٹونا غلط ہے۔ بھگوان کرے تم جگ جگ جیو۔ لیکن ان سے پوچھو، جن کی گودیں اس ڈائن نے سونی کر دیں، جن کے بچوں کو وہ زندہ چبا گئی۔ جن کے ہنستے کھیلتے گھروں کو اس نے مرگھٹ بنا دیا۔

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں بھر آئیں، گرم گرم آنسوؤں کے قطرے آنکھوں سے نکل کے زمین پر ڈھلک گئے۔ پھر بولیں۔

اُس پڑوسن کی بات ہے۔ اس کی بیٹی سُسرال سے لوٹی تھی —— گود بھر کے! ایک دن اس کا چھ سالہ ناتی آنگن میں کلک رہا تھا۔ کتنا خوب صورت تھا وہ بچہ! جیسے بنانے والے نے اپنے ہاتھوں سنوارا ہو۔ جو دیکھتا، ریجھ جاتا۔ کئی بار میرے گھر بھی آیا تھا —— زبردستی میرے کندھے پر چڑھ گیا۔ وہی مانگ کے کھایا۔ توتلی بولی، چکنے چکنے دودھ کے دانت۔ ہنستا تو اُجالا ہو جاتا۔ کلکلاتا تو پھول برستے۔ اور ویسے بچے کو.....

ہاں، ایک دن وہ بچہ اپنی انگنائی میں تھا کہ یہ بھُتنی پہنچی۔ یہ بھتنی —— ہاں اسی طرح آنسو بہاتی، ہونٹ ہلاتی، روپا کا ہاتھ پکڑے۔ اُسے دیکھتے ہی بچے کی ماں کا منھ سوکھ گیا، نانی ڈر گئی، چاہا بچے کو چھپا دے۔ لیکن وہ بچہ چھپائے جانے کے قابل بھی تو نہیں تھا! ادھمی، نٹ کھٹ! فوراً دوڑتا آیا اور اس چڑیل کے کندھے پر چڑھ گیا۔ چڑھ کے اس کے بالوں کو نوچنے، گردن کو ہلانے اور اپنے ننھے ننھے پیروں سے اسے ایڑ لگانے لگا۔ بچے کی اس حرکت سے بھتنی ہنس پڑی —— پہلی بار لوگوں نے اُسے ہنستے دیکھا۔ پھر خود گھوڑا بنی، بچے کو سوار بنایا اور بہت دیر تک گھوڑ دوڑ کرتی۔ بچے کو ہنساتی کھلاتی رہی۔ بار بار اسے سینے سے لگاتی، کہتی، ایسا بچہ دوسرا نہیں دیکھا۔ آہ میرا.....

لیکن بات ادھوری ہی چھوڑ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اُسے روتے دیکھ بچے نے ہی گدگدا کے، بہلا بہلا کے اسے چپ کیا۔ چڑیل گھر چلی، دعائیں

دیتی —— جگ جگ جیئے یہ بچّہ، تمھاری گود سدا بھری رہے بیٹی، بھری رہے' اسی طرح سونے کی مورتیں اُگلتی رہے! ماں ششدر، نانی کی جیسے جان میں جان آئی۔

لیکن، جانتے ہو، اس کے بعد کیا ہوا؟ کچھ ہی دنوں بعد لڑکے کو سوکھے کا روگ لگ گیا۔ کہاں گیا اس کا وہ روپ رنگ، وہ چہل وہ ہنسی۔ سوکھ کے کانٹا ہو گیا دن رات چیں چیں کیا کرتا۔ جو اسے دیکھتا، آنسو بہاتا اور ایک دن آنسوؤں کے اس سیلاب میں وہ .... اُف!

اُس دن اُس کی ماں کو تم دیکھتے۔ پاگل ہو گئی تھی بچاری! بچّے کی لاش کو پکڑ رکھا تھا، چھوڑتی نہیں تھی۔ کس کی ہمّت جو اس سے بچّے کو مانگتا۔ آنسو سوکھ کے شعلے بن گئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں برس رہی تھیں! بچّے کو سینے سے چپکائے تھی، جیسے دودھ پیتے بچے کو۔ اُلٹ پلٹ بولتی، بچّے کے منہ میں دودھ دینے کی کوشش کرتی! اسے چپ دیکھ کے کبھی کبھی چیخ اُٹھتی —— جب چیختی، معلوم ہوتا، اس کا کلیجہ پھٹ رہا ہے! سننے والوں کے بھی کلیجے پھٹتے۔ میں دیکھ رہا تھا، ماما کا کلیجہ جیسے آج بھی پھٹا جا رہا ہو، قصّہ کا اختتام لفظوں سے نہیں، آنسوؤں کی جھڑی سے ہوا۔

اور پھر ماما کے بچے کو بھی نواسی نے کھایا —— وہ بولتی نہیں ہیں، لیکن اُن کے حسرت ناک چہرے کے اُتار چڑھاؤ —— آنسوؤں کے قطرے۔ یہی کہہ رہے ہیں —— کم بخت کو بچّہ کھا کے بھی تسکین نہیں ہوئی، ماما کی کوکھ میں اس نے گویا راکھ بھر دی۔ تب سے ایک بھی بیٹا نہ ہوا۔ بہت دُعا تعویذ کے بعد

ہوئیں بھی تو دو بیٹیاں۔

مامی کو کون کہے، ایک دن ماما جی بھی میری دلیلوں پر ناراض ہو اٹھے اور اپنی آنکھوں دیکھا واقعہ سُنایا ——

وہ اونچی جگہ دیکھتے ہو نہ؟ وہاں ایک دو سادھ آبسا تھا۔ بوڑھا تھا، دو جوان لڑکے تھے اس کے۔ گھر میں بیوی، بہوئیں۔ دونوں بیٹے بڑے ہی کماؤ اولاد تھے۔ گٹھیلے جوان۔ بوڑھا بھی کافی ہنرمند تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں گاؤں میں اس کی پوچھ ہونے لگی۔ بازو کی طاقت تھی۔ کماتے، کھاتے۔ نیک مزاج —— نہ کسی سے جھگڑا نہ تکرار۔ سب ہی کو خوش رکھنے کی کوششیں کرتے سب کے کام آتے۔

ایک دن وہ بڑھیا۔ تمھاری روپا کی دادی —— پہنچی اور بولی، ذرا آج میرا ایک کام کر دو! بوڑھے نے دیکھتے ہی سلام کیا، بیٹھنے کو کُش کی چٹائی رکھ دی۔ بڑھیا نہیں بیٹھی —— دو سادھ سے ہڈی چھلا جاتی ہے، پھر میں باھنی ہوں۔ بوڑھا اور کچھ نہیں بولا، صرف عرض کی —— آج تو دوسرے بابو کو زبان دے چکا ہوں، کل آپ کا کام ہو جائے گا۔ بڑھیا نے ضد کی —— نہیں، آج ہی میرا کام ہونا چاہیے! بیچ میں بڑا لڑکا بول اٹھا —— دو سادھ سے ہڈی چھلائی جاتی ہے، تو کیا گھر نہیں چھلا جائے گا۔ بڑھیا تمک اٹھی —— میری تم توہین کرتے ہو؟ اسی لیے تو کہ میں لاوارث ہوں! مجھ سے تم کیوں ڈرو، میرا لڑکا ہوتا........ بڑھیا پہلے گرجی، اب برس رہی تھی۔ بوڑھا دو سادھ متحیر! ہاتھ جوڑ کے منت سماجت کرتا رہا۔

ابھی چلتا ہوں، ہم ابھی چلتے ہیں، بابو کا کام کل ہوگا، آج آپ ہی کا کیے دیتا ہوں۔
لیکن بڑھیا وہاں ذرا بھی کیوں ٹھہرتی؟ گھر لوٹ آئی۔

اسی راستے سے وہ گزر رہی تھی ——— ماما جی کہہ رہے تھے ——— میں نے دیکھا اس کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے، آنکھیں سُرخ تھیں، آنچل سے آنسوؤں کو خشک کرتی جاتی۔ پیچھے پیچھے بوڑھا دوڑا جا رہا تھا۔ بوڑھے کو روک کے میں نے پوچھا، اس نے ساری باتیں بتائیں۔ وہ کانپ رہا تھا ——— بابو' بال بچوں والا ہوں، نہ جانے کیا ہو جائے؟

اور یقین کروگے؟ تمھاری انگریجی، (انگریزی) تعلیم اس کا کیا جواب دیگی کہ اسی رات کو بڑے بیٹے کو سانپ نے کاٹ لیا۔

صبح کو دیکھا، ہائے، وہ نوجوان بے ہوش پڑا ہے۔ سارا جسم پیلا پڑ گیا ہے، منہ سے جھاگ نکل رہی ہے۔ گاؤں گاؤں سے زہر اُتارنے والے پہنچے ہوئے ہیں۔ کوئی زور زور سے منتر پڑھ رہا ہے۔ کوئی کوڑے پھٹکار رہا ہے، کوئی پوٹلیاں بیس کر پلانے کی کوشش میں ہے، کوئی اس ناک میں کچھ سنگھا رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ آنکھیں کھولتا ہے، رہ رہ کے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور پھر بے حس ہو جاتا ہے۔ بے حسی، بے ہوشی میں اور بیہوشی مردنی میں بدلتی جا رہی ہے۔ بوڑھا باپ سینہ کوبی کر رہا ہے، چھوٹا بھائی دھاڑیں مار مار کے رو رہا ہے۔ ماں اور بیوی کے حال کا کیا پوچھنا! زہر اُتارنے والے کہتے ہیں، ہم کیا کریں؟ سانپ کا زہر اُترتا ہے نہ؟ یہ تو آدمی کا زہر ہے! سیدھا جادو، ٹھیک آدھی رات کو چلایا گیا ہے۔ اُتر جائے تو تقدیر! بوڑھے کی تقدیر ویسی نہیں تھی۔ دھیرے دھیرے، ہم لوگوں کے

دیکھتے دیکھتے اس کے جوان بیٹے کی ارتھی اٹھ کے رہی۔ دوسرے ہی دن اس کا سارا گھرانا گاؤں چھوڑ کے چلا گیا!

ارے یہ بڑھیا نہیں کال ہے۔ آدمی نہیں ناگن ہے چلتی پھرتی چڑیل — باھنی ہے ورنہ اسے زندہ دفن کر دینا کوئی گناہ نہیں ہوتا!

ماما کی آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔

میں چپ تھا! جذبات پر دلیلوں کا کیا اثر ہو سکتا ہے بھلا؟

تیسوارتری کا یہ میلہ۔ لوگوں کی بے پناہ بھیڑ۔ بچے، جوان، بوڑھے، لڑکیاں عورتیں اور بوڑھیاں۔ شیوجی پر سالم چاول، بیل پتر، پھول پھل کے چڑھاوے۔ پھر اس ایک روزہ میلے میں گھوم پھر، خرید و فروخت، ریل پیل، چلنے کی ضرورت نہیں، اپنے کو بھیڑ میں ڈال دیجیے، خود بخود کسی کنارے پر جا لگیئے گا۔ بچوں اور عورتوں کی کثرت! انھیں کی پسند کے زیادہ سودے۔ کھنجڑیاں، سیٹیاں، جھنجھنے، مٹی کی مورتیں، ربر کے کھلونے، کپڑوں کے گڈے۔ رنگین مٹھائیاں، بسکٹ، لیمن جوس، بندیاں، سیندور، چوڑیاں، ریشم کے لچھے، نقلی گوٹے، چمکیلے پھٹے، آئینے، کنگھیاں، صابون، سستے اور رنگین پوڈر۔ بھاؤ تاؤ کی چھوٹ، ہلا، ہنگامہ! زیوروں کی جگمگاہٹ میں چوڑیوں کی کھنک، ساڑیوں کی سرسراہٹ میں ہنسیوں کی کھلکھلاہٹ۔

کہیں ناچ ہو رہا ہے، کہیں بہروپیئے سانگ بھر رہے ہیں، گھرنی اور چرخی پر بچے جھولے کا مزہ لوٹ رہے ہیں۔

اچانک ایک طرف سے شور اُٹھا ——— ”لگلی! لگلی!! لگلی!!!“ چھوڑو، چھوڑو، چھوڑو“! ——— ڈائن، ڈائن، ڈائن“ ”مارو، مارو، مارو!“

ایک عورت بھاگی جا رہی ہے ——— ادھ ننگی، ادھ موئی، لوگ اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ بات کیا ہے؟

میلے میں آئی ہوئی ایک نوجوان لڑکی اپنے بچّے کو اپنی ایک سکھی کے سپرد کر کے خریداری کرنے گئی تھی۔ سکھی ذرا چنچل تھی۔ بچے تو خیر چنچل ہوتے ہی ہیں۔ سکھی ’لال چھڑی‘ کی رنگین مٹھائی بیچنے کی بولی میں محو ہوگئی ——— ”میری لال چھڑی البتّہ، میں تو بیچوں کلکتہ!“ ادھر بچّہ اس کی انگلی چھوڑ، دھیرے سے وہاں سے نکل، جھنجھنے والے کے پاس پہنچ گیا۔ جب سکھی کا دھیان ’لال چھڑی‘ سے ہٹا تو وہ پریشان ہو کے بچّے کو ڈھونڈنے نکلی۔

دیکھتی کیا ہے، ایک بڑھیا اُس بچے کو گود میں لئے جھنجھنا دے رہی ہے اور مٹھائیاں کھلا رہی ہے! کیسی تھی اس کی شکل ——— پھٹا پُرانا لباس، دھول اٹا جسم، بکھرے بال، سُرخ سُرخ آنکھیں، لمبی لمبی ٹانگیں، بڑی بڑی باہیں! اُسے دیکھتے ہی سکھی چیخ پڑی ——— ڈائن! بڑھیا چونکی، غرّائی ——— ایں کیا بولتی ہے! لیکن وہ چلاّئے جا رہی تھی۔ ڈائن، ڈائن۔ ہنگامہ سُن کے بچّہ بھی چیخنے لگا۔ بڑھیا نے بچّے کو کندھے پر اُٹھا لیا! سکھی بوڑھیا کے پاس پہنچی۔ بچّے کو اس سے چھیننے لگی۔ ایک ہلاّ، ایک شور، ایک غوغا۔ اب بچّہ سکھی کی گود میں اور بڑھیا کو لوگ

چھوڑیئے اِس ذکر کو!

بہت دن ہوئے، ربی بابو (رابندر ناتھ ٹیگور) کی ایک کہانی پڑھی تھی۔ ایک شریف گھرانے کی عورت ہیضے سے مرگئی۔ لوگ جلانے کو شمشان لے گئے۔ چتا سجائی جارہی تھی کہ بارش ہونے لگی۔ لوگ چتا چھوڑ، پاس کی امرائی کی جھونپڑی میں جا چھپے۔ کالی رات تھی۔ جب پانی تھما، انھوں نے دیکھا، چتا سے لاش غائب! کیا گیدڑ کھا گیا؟ کھوج ڈھونڈھ بے کار گئی۔ لیکن بابو صاحب سے کیسے کہا جائے گا کہ اُن کی غفلت سے لاش غائب ہوگئی۔ جھوٹ موٹ چتا میں آگ لگا کے لوٹ آئے۔ اِدھر وہ بیچاری عورت پانی کے قطروں سے زندگی پا کے...... چتا سے اٹھی۔ تمام دن کھیتوں میں چھپی رہی۔ شریف گھرانے کی عورت تھی۔ رات کو جب گھر پہنچی، دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کی آواز سُن کے لوگ ڈرے ——— ارے بھوت، بھوت، بھوت!
میکے پہنچی۔ وہاں بھی بھوت، بھوت۔ بہن کے گھر پہنچی، وہاں بھی وہی بھوت، بھوت۔ جہاں گئی وہیں بھوت بھوت۔ آخر میں اس نے اپنے کو گنگا کی گود کے سپرد کر دیا۔

کیا رؤپا کی دادی، لوگوں کی، کچھ ایسی ہی غلط فہمی کی شکار نہیں ہوئیں۔ واقعات نے ان کے ساتھ سازش کی، لوگوں نے جلاد کا کام کیا۔

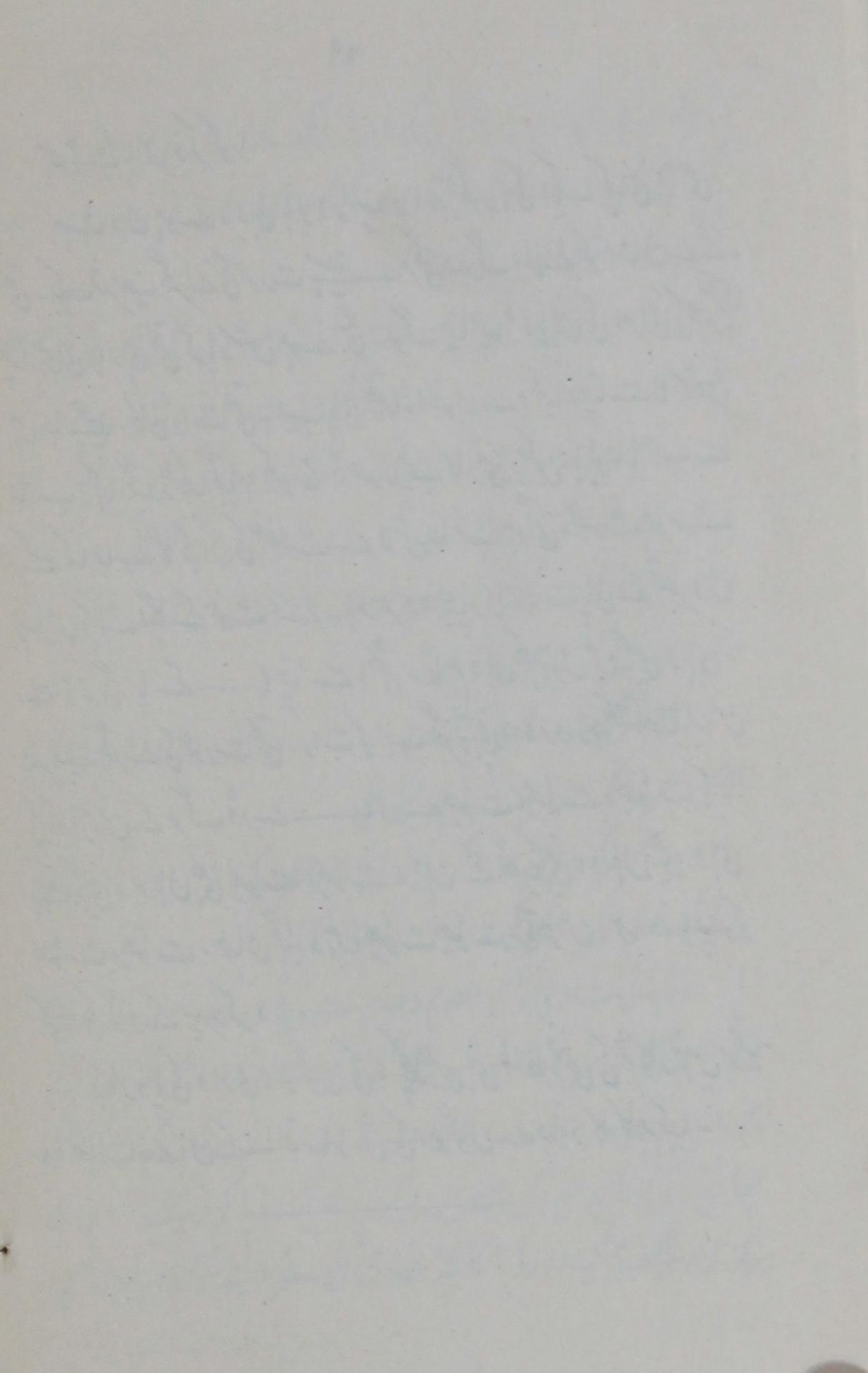
بیٹ رہے ہیں۔ بچہ بار بار اُس کی طرف دیکھ کے بُڑیا بُڑیا، کہہ اُٹھتا ہے گویا اُس کی مار پر اُسے رحم آرہا ہو، اس کی گود کے لئے بے قرار ہو رہا ہو۔ لیکن اُس پر کون دھیان دیتا ہے؟

بڑھیا بھاگی جارہی ہے، عورتیں، بچے، مرد اس کے پیچھے لگے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر وہ رُکتی ہے۔ دانت دکھاتی ہے، ہاتھ جوڑتی ہے، لوگ اُس پر ڈھیلے برساتے ہیں۔ اسی بھاگ دَوڑ میں وہ ایک ایسی جگہ پہنچتی ہے جہاں پہلے ایک کنواں تھا، اب اُس کی منڈیر خراب ہو گئی تھی۔ وہ کنواں دھنس رہا تھا۔ بھاگنے کی بدحواسی میں اس کا دھیان اس طرف نہیں رہا۔ وہ دھم سے اُس کنوئیں میں جاگری۔

بھیڑ رُکتی ہے۔ کوئی کہتا ہے ——— مرنے دو۔ دوسرا بولتا ہے نکالو! جب تک وہ تہہ آب ہو چکی تھی۔

یہ اس کی لاش ہے! کس کی لاش؟ بڑھیا کی لاش۔ رؤیا کی دادی کی لاش۔ رؤیا کی دادی کی لاش؟ وہ یہاں کہاں؟

رؤیا کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی اُس نے! تمام جائداد بیچ کے۔ جس صبح کو رؤیا کی ڈولی سُسرال گئی، اُسی شام کو وہ بھی گھر چھوڑ کے چل دی۔ کہاں ——— ؟ کون جانے! نہ جانے وہ کہاں کہاں کی خاک چھانتی، آج پہنچی تھی اُس میلے میں! کیوں؟ کیا رؤیا کو دیکھنے؟ اس کے بچے کو دیکھنے؟ کیا وہ رؤیا کا بچہ تھا؟ اُس نے اپنے کو ظاہر کیوں نہیں کیا؟



دیو

ببیسر بھائی کے باغیچے میں ولائتی امرود کا ایک درخت تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اس کی قلم ولایت سے آئی تھی یا کہاں سے۔ نئی قسم کی چیزوں کا، خاص کر جب وہ چھوٹی نسل کی ہوں تو ان کا 'ولائتی' نام پڑتے میں نے دیہاتوں میں عموماً دیکھا ہے۔ چھوٹے کتے، ولائتی کتے ہو گئے ہیں، ٹماٹر، ولائتی بینگن بن گیا ہے۔

ولائتی امرود کا یہ درخت عام درختوں سے چھوٹا تھا۔ اس کی ڈالیاں نازک اور لچکیلی تھیں۔ پتے گہرے سبز، کافی چکنے اور چھوٹے چھوٹے تھے۔ پھل بڑی سپاری سے زیادہ بڑے نہیں۔ پکنے پر ان کا رنگ دودھیا ہو جاتا۔ لیکن گودا ایک دم لال سُرخ!

ہم بچے اس پر کس طرح ٹوٹتے اور ہم سے رکھوالی کرنے میں ببیسر بھائی کیسی چوکسی برتتے —— کہنے کی ضرورت نہیں۔

"دیو! تم نے دیکھا ہے، ولایتی امرود کیسے پک گئے ہیں؟"

"کہو تو توڑ لاؤں!"

"ارے، تپیسر بھائی ٹانگیں توڑ دیں گے!"

"ہٹ، بڑے توڑنے والے آئے ہیں وہ۔"

وہ تیر کی طرح سن سے نکلا، درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں لیتا، دبکتا، چھپتا کہیں جھکتا، کہیں پیٹ کے بل رینگتا، دھیرے دھیرے وہ ولایتی امرود کے پیڑ کے نیچے پہنچا اور پھر بندر کی طرح، نہیں گلہری جیسا وہ سر سے درخت پر چڑھ گیا۔ ہم نے دور سے دیکھا، اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ تابڑ توڑ پکے امرود توڑ رہے ہیں اور اِدھر میرے منہ میں پانی بھر رہا تھا۔

لا بھئے لو بھ! دیو رفتہ رفتہ پتلی سے پتلی شاخ پر کھسکتا گیا اور میں نے دیکھا، وہ بڑھ کے ایک امرود توڑ رہا تھا۔ کہ اس کے پاؤں کے نیچے کی ڈالی کڑ کڑا کے ٹوٹ گئی۔ اوپر کی جس پتلی ڈالی کو وہ بائیں ہاتھ سے پکڑے تھا، وہ بھی اس کے پورے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکی۔ اُسے لئے لئے وہ دھم سے زمین پر آ رہا۔ اور یہ آواز سُن تپیسر بھائی اپنی جھونپڑی سے ڈنڈا لئے نکلے۔ دیو ایک منٹ بھی بیٹھا نہیں رہا۔ تیزی سے کھڑا ہوا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ بوڑھے تپیسر بھائی کہاں تک دوڑتے؟ گالی گلوج کر کے باغیچے میں لوٹ گئے۔

میں دوسری راہ سے جا کے اس سے مِلا۔ اس کے کوٹ کی دونوں جیبوں سے پکے امرود معہ پتوں کے جھانک رہے تھے۔ لو کھاؤ! —— اس نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالنا چاہا۔

"ارے! یہ کیا؟
دیکھا اُس کا بایاں بازو بے جان سا جھول رہا ہے۔ کہنی کی ہڈی اُتر گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، ہاتھ کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں، جو صرف چمڑے کے سہارے جُڑے ہوئے ہیں۔ بھاگنے کی فکر میں، دیو نے اس طرف دھیان بھی نہیں دیا تھا۔ میں سمجھا، اب اس طرف دھیان جاتے ہی، دیو تکلیف سے چلّا اٹھے گا۔ لیکن وہ۔
وہ بس ذرا سا چونکا۔ بغیر آہ، اُف کیے، امرود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، مجھ سے کہا —— جیب سے نکال لو۔ میں نکالتا گیا، کانپتے ہوئے بولا —— اُف دیو، تمھارا بازو ٹوٹ گیا۔
جُڑ جائے گا —— وہ لاپروائی سے بولا اور میرے انگوچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے —— ذرا اس سے سنبھال کے ہاتھ کو میرے گلے سے باندھ تو دو۔
اس کے ٹوٹے ہوئے بازو کو انگوچھے میں سنبھال کے، جھول کی طرح، اس کی گردن سے لٹکاتے ہوئے میں نے بڑی اذیت محسوس کی۔ لیکن اس نے ذرا اُف بھی نہ کی؟ ہاں اس کی آنکھیں کچھ لال ضرور ہو گئیں۔ میں نے کہا —— کیسے ہو تم، کیا درد نہیں ہوتا؟
ہوتا کیوں نہیں، لیکن چیخنے سے کیا حاصل؟ کیا اس سے درد کم ہو جائے گا؟ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی۔ کھیتوں میں مکئی، ساما، دھان، بھددی،

لہرا رہی تھی۔ راستوں اور سڑکوں پر طرح طرح کی گھاسیں اُگ آئی تھیں۔ درختوں کی دُھلی بچھی پتیاں من کو موہ رہی تھیں۔ گھروں پر کدو، جھینگنی وغیرہ کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔

اِنھیں ہریالیوں میں جنم اشٹمی پہنچ گئی۔ آم کے باغوں میں مٹھوا، بمبئی، مالدہ کی فصل ختم ہو چکی تھی ضرور، لیکن ابھی فضلی، بھدیا، راڑھی کے گچھے جھول ہی رہے تھے۔ کھیتوں میں، مکئی کے بالوں میں دودھ بھر آیا تھا۔ باڑیوں میں امرود کی شاخیں اور کھیرے کی بیلیں پھلوں سے لدی تھیں۔ ایک تو پھلوں کی یہ آسانیاں پھر دن بھر کا ہی تو برت تھا —— ہم بچوں کے لئے جنم اشٹمی سے بڑھ کے کون برت ہو سکتا تھا؟ ہم میں سے بہتیرے، برت کئے ہوئے تھے۔

باغ کے بیچ میں جو ٹھاکر باڑی ہے، اس میں برت کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لوگوں کی آمد و رفت لگی تھی۔ طرح طرح کے 'پرساد' تیار کئے جا رہے تھے؛ دھنئے کو بھون کر پنجیری بنانے کی جو تیاریاں ہو رہی تھیں، اس کی سوندھی خوشبو ہم بچوں کو پاگل بنا رہی تھی۔ ہم ٹھاکر باڑی سے کچھ دور پر، ایک پیڑ میں جھولا ڈالے، پینگوں پر پینگیں لے رہے تھے۔ اب سورج ڈوبے، آدھی رات گزرے، چاند کھلے، کرشن بھگوان جنم لیں اور ہم پھانکے پر پھانکے پنجیری پھانکیں —— ہماری بے صبری کا کیا کہنا؟

ہم، سات آٹھ بچے تھے۔ ایک دو بچیاں بھی تھیں۔ دلو بھی تھا۔ بغیر

پینگوں پر پینگیں! کبھی گانا، کبھی ہاہا، ہی ہی۔

سانپ! سانپ! ——— ایک لڑکی چیخ اٹھی۔ باغ سے ملی جو بانس باڑی تھی، اس میں ایک جوڑا گھمن رہتا ہے۔ یہ تو اکثر سُن رکھا تھا ہم نے، لیکن اس ٹھیک دوپہر کو، جب ہم اتنے آدمی اکھٹے ہو کے چہل کر رہے تھے، سانپ نکلے گا۔ اس کا گمان بھی نہیں گزرا تھا۔ لڑکی کی آواز کے ساتھ ہی، ہماری نظریں اُس سمت دوڑ گئیں، جدھر اس کی کانپتی ہوئی انگلی اشارہ کر رہی تھی۔ باپ رے! ——— سبھوں کے منہ سے نکلا، اور کئی تو بے تحاشا بھاگے۔ گھبرا تو ہم بھی گئے تھے۔ شاید اس بے ابر بھادوں کے سورج کی کرنوں کی انتہائی گرمی سے پریشان ہو کے، سانپ اپنے بل سے نکلا تھا، کسی سناٹی ٹھنڈی جگہ کی تلاش میں چلا تھا۔ جب کچھ بچے چیخ کے بھاگے تو ان کی آواز سُن، وہ جہاں کا تہاں ٹھٹک گیا اور سر اٹھا کے ہمیں اچھی طرح دیکھنا چاہا، اُف، اس کی شکل! لمبائی ڈھائی ہاتھ سے کم نہیں، پتیوں سے چھن چھن کے سورج کی جو کرنیں اس پر پڑ رہی تھیں اس سے اس کا گندمی جسم چمک رہا تھا۔ پھن پھیلائے وہ کھڑا تھا۔ پھن چار انچ سے کیا کم چوڑا ہوگا۔ دو حسین نشیلی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ زبان لپ لپ کرتی باہر نکل رہی تھی۔

کیا کیا جائے، یہ سوال اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ دیکھا، دبو ایک ڈنڈا لئے اُس طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے اسے روکنا چاہا۔ ہم نے سُن رکھا تھا دنیا میں ساڑھے تین بہادر ہیں۔ پہلا بھینسا، دوسرا سُور، تیسرا گھمن اور

اور نصف راجا رامچندر۔ بھینسا اور گھمن سیدھا وار کرتے ہیں، کبھی پیٹھ نہیں دکھاتے
رامچندر جی بہادر تھے، لیکن بالی کو مارنے کے لئے انھوں نے درخت کی اوٹ
لی تھی۔ اس طرح جو راجا رام چندر سے بھی بہادر تھے۔ ان میں سے ایک ہمارے
سامنے کھڑا ہے اور اسے زیر کرنے کو ہمارا یہ ننھا ساتھی، دیو، ایک چھوٹا
ڈنڈا لئے، بڑھ رہا ہے۔ چھوڑ دو اُسے، بھاگو! —— ہم چلّا ہی رہے
تھے کہ دیو سانپ سے ایک بانس کی دوری پر پہنچ گیا۔ اسے اپنی طرف
آتے دیکھ، ایک بار تو سانپ نے پھن سمیٹ کر نیچا کر لیا تھا۔ ہم سمجھے
اب وہ بھاگے گا۔ لیکن، نہیں، جیوں ہی دیو اس کے قریب پہنچا۔ اس
نے تقریباً ایک ہاتھ اونچا سر اُٹھا۔ پھن کو زیادہ سے زیادہ چوڑا کر ایسی
پھنکار چھوڑی، جس نے کرشن جی پر کالے ناگ کے پھنکار کی یاد دلائی۔
پھنکاریں مارتا، وہ سر کو لگاتار ہلا رہا تھا۔ جیسے غصّے میں کانپ رہا ہو۔
دیو، بھاگو! —— ہم نے چلا کر پھر کہا۔ لیکن، وہ اس کے پھن پر
نظریں جمائے۔ اپنا ڈنڈا سنبھالے کھڑا تھا۔ نہ تو سانپ ایک انچ آگے
بڑھتا، نہ دیو کے ہی پاؤں آگے یا پیچھے ہوتے۔ ادھر ہمارا جسم پسینے پسینے
ہو رہا تھا۔ دیو کی آنکھیں گھمن کی آنکھوں پر جمی تھیں۔

بھاگو! —— ہم پھر چلّائے۔ اسی وقت دیکھا، دیو اپنا ڈنڈا
سنبھال رہا ہے۔ اور چشم زدن میں اس نے چھوٹے ڈنڈے کو اس طرح
تول کے پھینکا کہ وہ زور سے سانپ کے پھن کے ٹھیک نیچے، زمین سے
تقریباً ایک بالشت اوپر، اس کی گردن پر کھٹ، تڑ سے لگا۔ ڈنڈا اس

زور سے لگا کہ سانپ معہ پھن کے اچانک اُلٹ گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کے اُٹھ کھڑا ہوا، صرف اس کی دُم کا چند انچ حصّہ زمین پر ہے، ورنہ وہ پورا کا پورا کھڑا ہے ——— پھن پھیلائے، جھومتا، پُھنکارتا۔ معلوم ہوتا تھا مجسم ملک الموت، تانڈو (غارت گری کا رقص) (ناچ) کر رہا ہے! دیو کا ہاتھ خالی ہے سانپ اگر اس پر ٹوٹتا تو آج اس کی خیر نہیں ——— ہم نے سوچا۔ لیکن کس کی ہمّت کہ دیو کی امداد میں موت کے منہ کی طرف بڑھے! دیو کھڑا تھا۔ کہیں اُسے ڈر سے سکتہ تو نہیں لگ گیا؟ بھاگو! بھاگو!

لیکن، یہ کیا؟ پھر فوراً ہی سانپ، خود بخود، اس طرح زمین پر گرا کہ ہم نے اس کے گرنے کی دھب سے آواز بھی سنی۔ گرنے کے بعد وہ لگاتار دُم پٹکنے اور زمین سے تھوڑا سر اُٹھا کے پُھنکاریں مارنے لگا۔ اس کے گرتے ہی ہم میں سے کچھ کی ہمتیں بندھیں۔ گلّی ڈنڈا کے جو ڈنڈے تھے، انھیں لے کے ہم آگے بڑھے۔ پہلا ڈنڈا ایسا لگا تھا کہ غالباً اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ لیکن جھونک میں وہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا مگر جھونک کے سہارے ٹوٹی ہوئی ہڈی کب تک تنی رہتی وہ گرا اور اب بے چارگی پر سر دھن رہا تھا۔ ہمیں بڑھتے دیکھ، دیو نے ہمیں روکا اور ہمارے ڈنڈے لے، اس نے خود کھلا کھلا کے اُسے مارا۔ پہلے دو تین ڈنڈے دور سے ہی پھینک کے مارے۔ پھر پاس جا کے اس کے جسم پر کئی ڈنڈے جمائے۔ پھر ڈنڈے کا ایک سرا اس کے منہ کے پاس لے جاتا، سانپ کچاچا کے پکڑتا، دیو کھلکھلا کے ہنستا۔ یوں ہی بہت دیر تک وہ سانپ سے موت کا کھیل کھیلتا رہا۔ اسی وقت دیو کے دادا ایک طرف سے آتے دکھائی دئے۔

ان کی کھانسی سُن، دیو چونکا اور جھٹ پٹ بار بار ڈنڈے برسا، سانپ کا سر بھُرتا بنا، قہقہے لگاتا بھاگا۔ ہم بھی اس کے ساتھ بھاگے۔

دیو کے دادا چاہتے تھے، دیو پڑھے۔ گاؤں کی پڑھائی جیوں تیوں ختم کرکے وہ شہر کے اسکول میں بھی گیا۔ لیکن وہاں زیادہ دنوں ٹک نہیں سکا۔

گاؤں لوٹ کے وہ گھر گرہستھی میں لگ گیا۔ عجیب ڈھنگ کا ارتقاء ہوا اس کا۔ جس نے ذرا چھیڑا، اُس سے الجھ پڑا۔ بات کا جواب ہاتھ سے، ہاتھ کا جواب لاٹھی سے۔ چاہے چوپایہ ہو یا دوپایہ، جس پر بھڑ گیا۔ بغیر قابو میں کئے چھوڑا نہیں۔ گاؤں کے سب سے اونچے بانس کے سرے کے پتے وہ توڑتا، سب سے اونچی شاخ کے پھل پہلے وہ چکھتا۔ اس کی بھینسیں ہمیشہ ہریالی پاتیں۔ اس کے بیل بے روک ٹوک گھومتے۔ کسی کا کھیت اُجڑتا ہو تو اُجڑے ——— دیو کو اس کی کیا پروا؟ اور کون اس سے منہ لگنے کی گستاخی کرتا؟

اس کے کردار پر سیاہ دھبّے لگانے والی کہانیاں بھی تھیں۔ لیکن نہ جانے کیوں، مجھے ہمیشہ ہی اس سے اُنس رہا۔ کئی بار ماما جی نے ڈانٹا، ڈپٹا.....

"کیوں اس سے باتیں کرتے ہو ——— ملتے ہو۔ وہ بدمعاش ہے، بدچلن ہے۔ تم پڑھ لکھ رہے ہو، ایسوں کی صحبت اور محبّت اچھی نہیں۔" جب وہ ناراض ہو کے بگڑتے، میں چُپ چاپ سُنتا۔ ان کی باتوں کی معقولیت اور صداقت پر شبہ کرنے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ لیکن سب کچھ جان سن کے بھی میں اپنے کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیوں؟ میں اس وقت

اس طرح کے سوالوں پر غور کرنے کا عادی نہیں تھا۔

ایک دن شام کا وقت تھا۔ میں چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ قدرتی مناظر سے دلچسپی کا میرا فطری جذبہ مجھے گاؤں سے کھینچ کے سبزہ زاروں کی سمت لے چلا۔ راستے میں دیو مل گیا۔ ہم دونوں چلے۔ ایک کھیت میں شکر قند کی بیلیں اتنی گھنی ہوگئی تھیں کہ اُن پر پاؤں رکھنے میں مخمل کا لطف آتا تھا۔ بیلوں میں یہاں وہاں لال لال پھول کھلے تھے —— گویا سبز مخملی فرش پر گلاب کی کلیاں کھلی ہوں۔ ہم اس پر بیٹھ گئے —— "دیو، کچھ گاؤ!"

"خوب! کبھی مجھے گاتے سُنا ہے؟"

"اچھا ایک کہانی!"

"کیسی؟ آپ بیتی؟" —— وہ مُسکرا پڑا۔ دیو میں ہمیشہ میں نے یہ وصف پایا کہ وہ جھوٹ کبھی نہیں بولتا۔ وہ اپنی محبت کی کہانی سُنانے لگا —— دیہات کے وہ رومان اور اُن رومانوں کے انوکھے 'ایڈونچر'۔ کب سورج ڈوبا، کس طرح کرنیں سمٹیں، پتہ نہیں چلا۔ یکایک اندھیرا دیکھ —— اب چلیں —— کہہ کے ہم چل پڑے۔

تھوڑی دور تک ساتھ آئے۔ یکایک دیو خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔

"اچھا آپ میری سنگت کیوں کرتے ہیں؟ آپ کی شکایت ہوتی ہے نہ؟"

"پاگل، شکایت کی تمھیں کیا پروا۔ ایسی باتیں نہ کہا کرو۔" وہ چُپ ہو رہا، پھر بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "اچھا کوئی ایک کام مجھے بتایئے، جسے میں کروں۔ کوئی اچھا کام، جو دیش کے لئے بھی فائدے کا ہو۔"

مجھے یاد آیا، میں کبھی کبھی ملک کی حالت پر دیو سے کچھ باتیں کیا کرتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے، وہ باتیں اس کے دل میں جم سی گئی تھیں۔ لیکن آج، اس کے اس سوال پر، میں کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ دیو اور دیش! خیر کچھ کہنا چاہئے تھا، کہہ دیا ——— "اور زیادہ کیا کرو گے، بس کھادی پہنو۔"

"لیکن کھادی تو شہروں میں ملتی ہے! اور کوئی شہر بھی یہاں سے بیس بائیس میل سے کم دور نہیں۔" پر دیو کو جیسے اپنی اس بات پر کچھ جھینپ سی ہوئی۔ پھر بولا ——— "اچھا میں کسی طرح منگا لوں گا۔"

دیو نے جس دن کھادی پہنی، گاؤں میں کچھ عجیب مذاق رہا۔ لوگ آپس میں کہتے ——— "ستر چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی!" لیکن دیو کے سامنے کوئی کیا بولتا؟

سنہ تیس کا طوفان ختم ہوا ہی تھا کہ بتیس کی آندھی زوروں پر چل پڑی۔ ساڑھے چار ہزار 'بدو ماغوں' کے ساتھ میں بھی پٹنہ کیمپ جیل کے مزے لے رہا تھا۔ روزانہ نئے لوگوں کے جھنڈ آتے، پرانے لوگوں کے جاتے، آمد و رفت کا یہ سلسلہ اتنے دھڑلّے سے جاری تھا کہ اب اس میں خوشی اور غم کا کوئی احساس باقی نہیں رہ گیا تھا۔ سمندر میں کتنی ندیاں گرتیں، کتنا پانی بھاپ بن کے اڑ جاتا ہے پر وہ اپنی ہی ترنگوں میں مست رہتا ہے۔ گھٹ بڑھ کا وہاں سوال کہاں؟

لیکن ایک دن جب پھاٹک سے ایک جانی پہچانی شکل کو اندر آتے دیکھا اور معلوم ہوا، وہ دیو ہے، تو میری حیرت اور مسرت کا ٹھکانہ نہیں رہا۔

ادھر کچھ عرصے سے دیو سے تعلق کم رہ گیا تھا۔ میں مصنف تھا، اڈیٹر تھا، وطن پرور تھا، رہنما تھا۔ اب فرصت ہی کہاں تھی کہ میں دیو کی خبر لیتا!

اور دیو جیل میں؟ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لیکن فرطِ مسرت میں کچھ پوچھنے کی فرصت بھی کہاں تھی؟ اُسے اپنے ہی وارڈ میں لے آیا۔ شام کا وقت ہو چکا تھا۔ کھانے پینے کے بعد فوراً ہی وارڈ بند ہو گیا۔ گاؤں کا حال پوچھتے، بات چیت کرتے، ہم دونوں کو نیند آ گئی۔ ہم پاس ہی پاس سوئے تھے۔ ابھی سوئے ہی تھے کہ میری آنکھیں کھل گئیں اور سُنا، دیو کچھ کراہ رہا ہے —— جیسے انتہائی تکلیف ہونے پر، دھیرے دھیرے، لیکن بڑے درد سے کراہتے ہیں۔ دیو کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے، بُرا خواب —— میں نے جھنجھوڑ کے اُسے جگایا۔ وہ جاگا، لیکن پوچھنے پر کچھ بولا نہیں۔ پھر اُسے جب نیند آئی تو وہی بات۔ ایک بار اور اُٹھا۔ لیکن کتنی بار جگاتا اُسے؟

دوسرے دن گنگن نے، جو اس کے ساتھ آیا تھا، اِس راز کا انکشاف کیا۔

اب دیو پُرانا دیو نہیں ہے۔

دیو اپنے تھانے کے واحد رہنما کی حیثیت میں اس بار یہاں آیا ہے۔ رہنما؟ ہاں، ہاں، ہاں۔

لیکن اس رہنمائی کی کیسی قیمت چکانی پڑی ہے اُسے!

دیو کا تھانہ، ضلع بھر میں کیا، اپنے کام کی وجہ سے پورے صوبے میں شہرت حاصل کر گیا تھا۔ کانگریس بلیٹنوں میں اس کا ذکر ہوتا وہاں سینیا گرہیوں کی ٹولیاں لگاتار حکومت کو پریشان اور سب ڈویژن کے چھوٹے سے جیل کو آباد کیے

رہتیں۔ ضلع کے حکام بڑے چکر میں تھے۔ پولیس کے دھاوے، جیل، جرمانے، قربانیاں کچھ بھی کارگر نہ ہوئیں۔ جب تک اِن خرافات کی بنیاد —— دیو —— کو نہیں پکڑا جاتا، تب تک سب کارروائیاں فضول تھیں۔ اور دیو کو پکڑنے کی تمام کوششیں بار بار ناکام ثابت ہو چکی تھیں۔

لیکن پولیس جو کام ہزار سرگرمی دکھا کر اور لاکھ سر ٹپک کے نہیں کر سکی۔ اُسے دیو نے خود ہی کر دیا۔ اب کچھ جیل کا بھی لطف اٹھایا جائے۔ اس نے فیصلہ کیا۔ خبر کر دی گئی، فلاں دن تھانے پر جلوس جائے گا۔ اور اس کی رہنمائی کرنے کا خود دیو۔ داروغہ جی کو اپنی طاقت پر بھروسہ نہیں ہوا۔ کچھ مسلح پولیس لے کے انسپکٹر صاحب بھی آئے۔ پانچ ہاتھ کا یہ دیو پکڑا گیا۔ انسپکٹر! جلوس کے رہنما کی حیثیت میں دیو پکڑا گیا۔ گُنگن وغیرہ بھی گرفتار ہوئے۔ سبھوں کو تھانے کی چھوٹی سی حوالات میں ٹھونس دیا گیا! شام گزری، رات آئی۔ آدھی رات، سنّاٹے کا عالم۔ اُسی وقت حوالات کھلی۔ دیو اٹھایا گیا۔ اُسے بغل کے کمرے میں لے جایا گیا۔ اس کے بعد........؟

اس کے بعد........ گُنگن کے چہرے پر غصّہ تھا، آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ وہ بولا —— پوچھیے نہیں، اس کے بعد کیا ہوا؟ اُف، انسپکٹر........ نے........ اُف........

ہم اس کی دہاڑ، گرج سُن رہے تھے۔ لگاتار تڑاق تڑاق کی آوازیں سُن رہے تھے۔ کسی کے گرنے اور اٹھنے کی آوازیں سُن رہے تھے۔ کیا دیو جی پر مار پڑ رہی ہے؟ —— لیکن وہ چلاتے تو نہیں ہیں؟

اور یہی نہیں چلاتا تو اُن کے لئے مصیبت ثابت ہوا۔ انسپکٹر اپنے چمڑے منڈھے ڈنڈے سے، طمانچوں سے۔ گھونسوں سے، گر جانے پر، بھاری بوٹوں سے، لگاتار وار کرتا رہا۔ لیکن دیو جی چلاتے کیا، ان کی آنکھوں میں آنسو تک نہیں آئے۔ آج تمہیں رُلاؤں گا، یا جان سے مار ڈالوں گا! —— یہ انسپکٹر کی آن، اور دیو جی اپنی شان پر جان دے رہے تھے۔

ہاں، جان دے رہے تھے۔ مار کھاتے کھاتے وہ بیہوش ہو گئے۔ پانی پلا کے انہیں ہوش میں لایا گیا۔ روتے ہو یا مرتے ہو —— اس انسپکٹر کے بچے نے پوچھا۔ دیو جی مسکرا پڑے۔

ہاں، داروغہ جی نے خود ہم سے کہا تھا، دیو جی مسکرا پڑے۔ پھر کیا تھا، اس نے ڈنڈے، لات، گھونسے اور بوٹ چلانے شروع کر دیئے۔ دیو پھر بے ہوش ہو گئے۔ بیہوش ہو کے جب دیو جی گرے، ان کے سینے پر بوٹ کے ساتھ وہ چڑھ گیا اور ہچکنے لگا۔ دو تین ہچ —— دیو جی کے منہ سے خون نکل آیا ——

خون، حضور خون —— داروغہ چلّا اُٹھا۔

مرنے دو سالے کو —— غصّے سے آگ بگولا انسپکٹر بولا ——

اس نے ہمیں پریشان کر رکھا تھا۔

لیکن کہنا جتنا آسان تھا، خون کرنا بھی اتنا ہی آسان ہوتا! اس نے بھی آخر حالت کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اِدھر ہنگامہ سُن کے ہم نے بھی حوالات سے شور و غل شروع کیا۔ سُنا وہ ہماری خبر لینے کو بھی تیار ہوا، لیکن داروغہ

نے روکا ـــــ حضور، اگر یہ بات لوگوں کو معلوم ہوگئی تو ہم سے ایک بھی آج کی رات زندہ نہیں بچے گا ـــــ آپ اس علاقے کو نہیں جانتے ہیں حضور!
انسپکٹر اسی وقت وہاں سے چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد داروغہ جی، دیوجی کو ہمارے پاس لائے۔

اُف، اُن کی حالت! سارا جسم زخموں سے چور!

لیکن دیوجی نے ذرا اُف بھی نہ کی ـــــ نہ یہ باتیں بتائیں! اسی رات کو موٹر سے ہمیں سب ڈویژنل جیل بھیج دیا گیا۔ صبح ہوتے ہوتے دیوجی کا سارا جسم پھول گیا۔ علاج ہوا۔ بظاہر اچھے بھی ہوئے، لیکن درد کو اوپر نہ آنے دینے کی انھوں نے جو انتہائی کوشش کی، اس نے، معلوم ہوتا ہے، تکلیف کو آخری حد تک پہنچا دیا ہے۔ اسی لئے رات کو جب وہ سوتے ہیں، اس طرح کراہتے ہیں ـــــ گنگن نے بات ختم کی اور ایک لمبی سانس لی۔

دن کی روشنی میں، میں نے دیو کو اچھی طرح دیکھا، جسم اب بھی سیاہ داغوں سے بھرا پڑا تھا۔ لیکن ان سیاہ داغوں والے جسم کے اندر جو رُوح تھی؟ ـــــ روشن، منوّر، تجلّی، پاکیزہ!

بال گوبند بھگت

نہ جانے وہ کونسی طاقت تھی جس نے میری برہمنیت کا پُرافتخار سر اُس تیلی کے سامنے جُھکا دیا تھا۔ جب وہ سامنے آتا، میں جھک کے، رام رام، کئے بغیر نہیں رہتا۔ مانا وہ میرے بچپن کے دن تھے، لیکن برہمنیت اس وقت پورے آب و تاب سے مجھ پر سوار تھی۔ دونوں وقت پوجائیں ہوتیں، گائتری کا جاپ ہوتا، دھوپ، ہون جلائے جاتے، چندن تلک کیا جاتا اور ان تمام کاوشوں سے 'برہم' کو پہچان کے 'پکا برہمن' بننے کی کوششیں ہوتیں۔ جو برہم کو جانے وہ برہمن!، اس برہمنیت کے جوش میں میں نے ایسے کئی برہمنوں سے بھی بہتر لوگوں کا، پالاگن، کرنا چھوڑ دیا تھا، جنھیں بچپن سے ہی گاؤں کے ناتے سے، کرتا آیا تھا۔ کہاں میں اور کہاں ہمارے سماج کی سب سے نچلی سطح کا یہ تیلی ——— کیوں بے ساختہ میرے سر کو جُھکا لیتا ہے یہ؟ تیلی ——— جس کا

منہ دیکھنے کے بعد سفر کرنا سعد نہیں سمجھا جاتا —— انہیں ایسا ہی درجہ دے رکھا تھا۔ ہمارے سماج نے 'تیلیا مسان' —— یہ تضحیک آمیز فقرہ چسپاں ہے۔ جس ذات کے ساتھ! اور اس وقت تک مجھ میں اتنی سمجھ بھی نہیں تھی کہ سمجھوں یہ تمام باتیں، ہمارے بوسیدہ سماج کے تنفر آمیز رجحانات کی علامتیں ہیں!

ہاں، بال گوبند بھگت تیلی تھے۔ لیکن، تیلیوں میں عموماً پایا جانے والا، کالا رنگ نہیں تھا، ان کا۔ میانہ قد کے گورے چٹے آدمی تھے۔ ساٹھ سے اوپر کے ہی ہوں گے۔ بال پک چکے تھے۔ لمبی ڈاڑھی یا جٹا تو نہیں رکھتے تھے، لیکن ان کا چہرہ سفید بالوں سے ہمیشہ جگمگاتا رہتا۔ کپڑے بالکل مختصر پہنتے، کمر میں ایک لنگوٹی ہوتی اور سر پر کبیر پنتھیوں جیسی کن پھٹی ٹوپی۔ جب جاڑے کا موسم آتا —— ' ایک کالی کملی اوپر سے اوڑھے رہتے۔ پیشانی پر ہمیشہ چمکتا ہوا، راما نندی، چندن، جو ناک کے ایک سرے سے، عورتوں کے ٹیکے کی طرح، شروع ہوتا۔ گلے میں تلسی کی جڑوں کی ایک بیڈول سی مالا ڈالے رہتے۔

اوپر کی تصویر سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ بال گوبند بھگت سادھو تھے۔ نہیں نرے گرہست۔ ان کی 'گرہنی' (بیوی) تو مجھے یاد نہیں، لیکن اُن کے بیٹے بہو کو میں نے دیکھا تھا۔ کچھ کھیتی باڑی بھی تھی۔ ایک اچھا، صاف ستھرا مکان بھی تھا۔

لیکن کاشتکاری کرتے اور کنبہ رکھتے ہوئے بھی بال گوبند بھگت سادھو تھے۔ ایک سادھو کے تمام اوصاف کے مالک تھے۔ کبیر کو 'صاحب'

مانتے تھے، انھیں کے گیتوں کو گاتے، انھیں کے احکام پر چلتے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، کھرا برتاؤ کرتے۔ کسی سے بھی صاف صاف بات کہنے میں نہیں جھجکتے، نہ کسی سے خواہ مخواہ جھگڑا مول لیتے۔ کسی کی چیز نہیں چھوتے، نہ بغیر پوچھے استعمال میں لاتے۔ اس اصول کو کبھی کبھی اتنی دور تک لے جاتے کہ لوگوں کو حیرت ہوتی —— کبھی وہ دوسروں کے کھیتوں میں رفع حاجت کے لئے بھی نہیں بیٹھتے! وہ گرہست تھے لیکن تمام چیزیں 'صاحب' کی تھیں۔ جو کچھ پیدا ہوتا، سر پر لاد کے، پہلے اُسے 'صاحب' کے دربار میں لے جاتے —— جو ان کے گھر سے چار کوس کی دوری پر تھا —— ایک کبیر پنتھی مٹھ سے مراد ہے —— دربار میں نذرانہ کی شکل میں پیش کرتے اور وہاں رکھ لئے جانے کے بعد، تر کا جو کچھ انھیں واپس ملتا، اُسے وہ گھر لاتے اور اسی پر گزر کرتے!

ان سب کے علاوہ میں تو شیدائی تھا ان کے مدھر گانے کا —— جو ہمیشہ ہی سُننے کو مل جایا کرتا تھا۔ کبیر کے وہ سیدھے سادھے بھجن، جو ان کے گلے سے نکل کے جاندار بن جاتے۔

اساڑھ کی رم جھم ہے۔ سارا گاؤں کھیتوں میں اُتر پڑا ہے، کہیں ہل چل رہے ہیں، کہیں 'روپنی' ہو رہی ہے۔ دھان کے پانی بھرے کھیتوں میں بچے اچھل رہے ہیں۔ عورتیں کھانے کا سامان لے کے مینڈھوں پر بیٹھی ہیں۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہے۔ دھوپ کا نام نہیں۔ ٹھنڈی پُروائی چل رہی ہے۔ ایسے میں آپ کے کانوں میں نغمے کی لہر گونج اٹھتی ہے۔ یہ کیا —— یہ

کون ہے؟ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ بال گو بند بھگت، سارا بدن کیچڑ میں لت پت کئے، کھیت میں روپنی کر رہے ہیں۔ ان کی انگلیاں دھان کے ایک ایک پودے کو قطار در قطار، کھیت میں بٹھا رہی ہیں۔ ان کا گلا ایک ایک لفظ کو، موسیقی کے زینے پر چڑھا کے، کچھ کو اوپر عرش معلیٰ کی طرف بھیج رہا ہے، اور کچھ کو اس زمین پر کھڑے لوگوں کے کانوں تک! بچے کھیلتے ہوئے جھوم اٹھتے ہیں، مینڈوں پر کھڑی عورتوں کے ہونٹ کانپ اٹھتے ہیں۔ وہ گنگنانے لگتی ہیں۔ ہالیوں کے قدم تال پر اٹھنے لگتے ہیں! روپن ہاریوں کی انگلیاں ایک عجیب تال سے چلنے لگتی ہیں۔ بال گو بند بھگت کی یہ موسیقی ہے یا جادو!

بھادوں کی وہ اندھیری آدھی رات۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے موسلا دھار بارش تھمی ہے۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی تڑپ میں ہو سکتا ہے۔ آپ نے کچھ نہیں سنا ہو، لیکن اب جھینگروں کی جھنکار اور مینڈکوں کی ٹرٹر بال گو بند بھگت کی موسیقی کو اپنی آواز سے دبا نہیں سکتی۔ ان کی خنجڑی ڈک ڈک بج رہی ہے۔ اور وہ گا رہے ہیں ——— "گودی میں پیوا، چمک اٹھے سکھیا، چہونک اٹھے نا" ——— ہاں پیا تو گود میں ہی ہے، لیکن وہ سمجھتی ہے، وہ اکیلی ہے، چمک اٹھتی ہے، چونک اٹھتی ہے بھرے بادلوں والے بھادوں کی اس آدھی رات کو ان کا یہ گانا، اندھیرے میں اچانک کوندا اٹھنے والی بجلی کی طرح، کسے چونکا نہیں دیتا؟ جب ساری دنیا سناٹے میں بیٹھی نیند میں سو رہی ہے۔ بال گو بند بھگت کی موسیقی جاگ رہی ہے، جگا رہی ہے! —

"تیری گٹھری میں لاگا چور، مسافر جاگ ذرا!"

کاتک آیا نہیں کہ بال گو بند بھگت کی پربھاتیاں شروع ہوئیں، جو پھاگن تک چلا کرتیں۔ ان دنوں میں وہ سویرے ہی اٹھتے۔ نہ جانے کس وقت اٹھ کے وہ ندی

میں اشنان کو جاتے ـــــ گاؤں سے دو میل دور! وہاں سے نہا دھو کے لوٹتے اور گاؤں کے باہر کی اونچی بینڈ پر اپنی خنجری لے کے جا بیٹھتے اور گانا شروع کر دیتے۔ میں سدا سے دیر تک سونے کا عادی ہوں، لیکن ایک دن، ماگھ کی اس دانت بجانے والی صبح کو بھی، ان کا گانا مجھے پو کھر پر لے گیا۔ ابھی ستاروں کے چراغ بجھے نہیں تھے۔ ہاں پورب میں پو پھٹ رہی تھی، جس کی سُرخی کو اختر صبح اور بھی حسین بنا رہا تھا۔ کھیت، باغ، مکان سب پر کہر چھا رہا تھا۔ ساری فضا کچھ عجیب رنگین، پراسرار سی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسے پُراسرار ماحول میں ایک کوس کی چٹائی پر پورب رُخ، کالی کملی اوڑھے بال گوبند بھگت اپنی خنجری لئے بیٹھے تھے۔ ان کے گلے سے نغمے پھوٹ رہے تھے، ان کی انگلیاں خنجری پر لگاتار ناچ رہی تھیں۔ گاتے گاتے اس طرح مست ہو جاتے، اس درجہ سرور میں آ جاتے، جوش میں بھر جاتے کہ معلوم ہوتا اب کھڑے ہو جائیں گے۔ کملی بار بار سر سے نیچے سرک جاتی۔ میں جاڑے سے کانپ رہا تھا، لیکن تاروں کی چھاؤں میں ان کی پیشانی عرق آلود ہو کے اکثر چمک اُٹھتی۔

گرمیوں میں ان کی 'سنجھا' نہ جانے کتنی اُمس بھری شاموں کو خنک بناتی! اپنے گھر کی انگنائی میں آسن جما بیٹھتے۔ گاؤں کے اُن کے کچھ پریمی بھی جُٹ جاتے۔ خنجڑیوں اور کرتالوں کی بھرمار ہو جاتی۔ ایک پد بال گوبند بھگت گاتے، ان کی پریمی منڈلی اسے دہراتی، تہراتی۔ رفتہ رفتہ سُر اونچا ہونے لگتا ـــــ ایک متعین 'تال'، ایک مقررہ رفتار سے۔ سُر، تال کے اس چڑھاؤ کے ساتھ، سُننے والوں کے دل بھی اوپر اٹھنے لگتے۔ آہستہ آہستہ 'من' 'تن' پر حاوی ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ ایک ایسا لمحہ بھی آ جاتا جبکہ بیچ میں بال گوبند بھگت خنجڑی لئے ناچتے ہوتے اور ان کے ساتھ ہی

سب کے تن اور من محو رقص ہو جاتے۔ ساری انگنائی رقص و موسیقی سے معمور ہو جاتی!

بال گوبند بھگت کی موسیقی کے ریاض کا انتہائی کمال اُس دن دیکھا گیا جس دن ان کا بیٹا مرا۔ اکلوتا بیٹا تھا وہ! کچھ سُست اور بودا سا تھا، لیکن اس وجہ سے' بال گوبند اُسے اور بھی مانتے۔ ان کے خیال کے مطابق' ایسے لوگوں پر زیادہ دھیان رکھنا چاہیئے اُسے پیار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ نگرانی اور محبت کے زیادہ حقدار ہوتے ہیں۔ بڑی کاوشوں سے اس کی شادی کرائی تھی۔ بہو بڑی ہی باسلیقہ اور سلیم الطبع ملی تھی۔ گھر کی پوری منتظمہ بن کے بال گوبند بھگت کو دنیا داری سے بہت کچھ آزاد کر دیا تھا اس نے۔ ان کا بیٹا بیمار ہے، یہ خبر رکھنے کی فرصت کسے تھی۔ لیکن موت تو اپنی طرف سب کی توجہ زبردستی کھینچ کر ہی رہتی ہے۔ ہم نے سنا، بال گوبند بھگت کا بیٹا مر گیا۔ گھبرایا ہوا ان کے گھر پہنچا۔ دیکھ کے دنگ رہ گیا۔ بیٹے کو انگنائی میں ایک چٹائی پر لٹا کے ایک سفید کپڑے سے ڈھنک رکھا ہے۔ وہ کچھ پھول تو ہمیشہ ہی اگائے رہتے تھے، انھیں میں سے کچھ پھول توڑ کے اس پر بکھیر دئے ہیں۔ پھول اور تلسی بھی' سرہانے ایک چراغ جلا رکھا ہے اور اس کے سامنے زمین پر ہی آسن جمائے گیت گائے چلے جا رہے ہیں! وہی پرانا نغمہ، وہی پرانی محویت۔ گھر میں بہو رو رہی ہے' جسے گاؤں کی عورتیں چپ کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ لیکن بال گوبند بھگت گائے جا رہے ہیں۔ ہاں، گاتے گاتے، کبھی کبھی بہو کے پاس بھی جاتے اور اس سے رونے کے بدلے خوشی منانے کو کہتے۔ آتما پرماتما کے پاس چلی گئی، پروانہ شمع سے جا ملا۔ بھلا اس سے زیادہ خوشی کی اور کونسی بات ہوگی؟ میں کبھی کبھی سوچتا یہ پاگل تو نہیں ہو گئے۔ لیکن نہیں، وہ جو کچھ کہہ رہے تھے، اس میں ان کا ایمان

بول رہا تھا ـــــــــ وہ ایمان کا ل جو ہمیشہ ہی موت پر فتح یاب ہوتا آیا ہے۔

بیٹے کے کریا کرم میں طول نہیں کیا، بہو سے ہی آگ دلوائی اس کی ــــــ
لیکن جوں ہی شرادھ کی مدت ختم ہوئی، بہو کے بھائی کو بلا کے اُس کے ساتھ کر دیا،
یہ ہدایت کرتے ہوئے کہ اس کی دوسری شادی کر دینا۔ ان کی ذات کے لوگوں میں
دوسری شادی کوئی نئی بات نہیں، پر بہو کی التجا تھی کہ وہ یہیں رہ کے، بھگت جی
کی خدمت وبندگی میں اپنی بیوگی کے دن گزار دے گی۔ لیکن بھگت جی کا کہنا تھا۔
ـــــــــ نہیں ابھی یہ جوان ہے، جذبات واحساسات پر برابر قابو رکھنے
کی عمر نہیں ہے اس کی من ہی تو ہے، کہیں اس نے غلطی سے نیچے اونچے میں پاؤں
رکھ دیا تو! نہیں نہیں تو جا!" اِدھر بہو رو کے کہتی ـــــــــ میں چلی
جاؤں گی تو بڑھاپے میں کون آپ کے لئے کھانا پکائے گا، کہیں بیمار پڑے
تو کون ایک چلو پانی بھی دے گا! میں پاؤں پڑتی ہوں، مجھے اپنے قدموں سے
جدا نہ کیجیے! لیکن بھگت جی کا فیصلہ اٹل تھا ـــــــــ تو جا، ورنہ میں ہی اس گھر
کو چھوڑ کے چل دوں گا۔ یہ تھی ان کی آخری منطق اور اس منطق کے آگے بیچاری
کی کیا چلتی۔

بال گوبند بھگت کی موت بھی ان کے حسب حال ہی ہوئی۔ وہ ہر سال گنگا اشنان
کو جاتے۔ اشنان پر اتنا اعتقاد نہیں تھا، جتنا 'سنتوں' کی صحبت پر۔ پیدل ہی جاتے۔
تقریباً تیس کوس گنگا تھی۔ سادھو کو زادِ راہ لینے کا کیا حق؟ اور گرہست کسی سے
بھیک کیوں مانگے؟ اس لئے گھر سے کھا کے چلتے، تو پھر گھر ہی پر لوٹ کے کھاتے
راستے میں کھنجڑی بجاتے، اور گاتے جاتے۔ جہاں پیاس لگتی، پانی پی لیتے۔ جانے

آنے میں چار پانچ دن لگتے ۔لیکن اس لمبے فاقے پر بھی وہی مستی ! اب ضعیفی آگئی تھی ، لیکن آن بان وہی جوانی والی ، اس بار لوٹے تو طبیعت کچھ سُست تھی ۔ کھانے پینے کے بعد بھی طبیعت نہیں سدھری ۔ کچھ بخار آنے لگا ۔لیکن وہ معمولات اور برت تو چھوڑنے والے نہیں تھے ۔ وہی دونوں وقت گیت ، اشنان ، دھیان ، کھیتی باڑی ، دن بدن نحیف ہونے لگے ۔ لوگوں نے نہانے دھونے کو منع کیا ، آرام کرنے کا مشورہ دیا ۔لیکن ہنس کے ٹالتے رہے ۔ اس دن بھی شام کو انھوں نے گیت گائے ،لیکن معلوم ہوتا تھا ، دھاگا ٹوٹ گیا ہو اور مالا کے سبھی دانے بکھر گئے ہوں ! صبح کو لوگوں نے گیت نہیں سُنا ——— جا کے دیکھا تو بال گوبند نہیں تھے ، صرف ان کا جسد خاکی پڑا تھا ۔

بھابی

میں اس دن زندگی میں پہلی بار پالکی پر بیٹھا تھا۔ بھیّا کی برات جا رہی تھی میں شہ بالا تھا۔ پالکی پر بھیّا بھی تھے اور میں بھی تھا۔ چار مسٹنڈے کہار ہمیں ڈھوئے جا رہے تھے۔ پالکی کے اندر چمکیلے پھندے لٹک رہے تھے، اور زری کار چوبی کا کام جگمگا رہا تھا۔ آگے پیچھے باجے بج رہے تھے —— ڈھول، شہنائی، بانسری، تاشے، سنکھ، سب مل جل کے کچھ عجیب ڈھنگ کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ بغل میں علم لئے اور پھریرے پھہراتے پیادے چل رہے تھے۔ ہمارے بُودل ٹھاکر حجام ہم پر مورچھل ہلا رہے تھے۔ گھوڑے تو سواروں کو لے کے تیزی سے آگے نکل گئے تھے، ہاتھیوں کے گھنٹے ہم سن رہے تھے۔

بھیّا سجے سجائے تھے۔ رنگین زرق برق کپڑے، سر پر زری کی ٹوپی —— ان کی پیشانی پر صندل کی عجیب چھاپ تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا، ہونٹوں کو، جن پر مسیں بھیگ رہی تھیں، وہ ایک رومال سے ڈھکے ہوئے تھے۔ نہ جانے

بھیا کے دل میں کیسے کیسے جذبات ابھر رہے تھے؟ لیکن میں تو مست تھا، برات کے سفر میں، اس باجے گاجے میں، کبھی کبھی سوچتا، بھابی کو بھیا سے پہلے تو میں ہی دیکھوں گا!

شام کو برات دروازے لگی۔ اچھی برات تھی اچھا استقبال ہوا چونے سے پُتا بھیا کی سُسرال کا وہ کھپریل کا مکان شور و غل سے گونج رہا تھا۔ دروازے کے اندرونی حصے میں عورتوں کا ایک اچھا خاصا جھنڈ بھیا کا چوماون، کر رہا تھا۔ بھیا کے ہاتھ میں پان سپاری رکھے گئے، رُپے رکھے گئے، دہی کی چھوٹی ٹھکی رکھی گئی۔ بھیا کی اس آؤ بھگت پر میرے دل میں کچھ رشک جاگا ہی تھا کہ ایک جوان لڑکی میرے گال پر دہی لگا کے قہقہے لگانے لگی —— ہنسی کی ایک لہر سی دوڑ گئی! سبھی عورتیں —— نہیں نوجوان لڑکیاں زور زور سے ہنس رہی تھیں۔

اس ہنسی کے ساتھ ہی ہمارے کانوں سے قہقہوں کا طوفان آکے ٹکرایا۔ دروازے کے باہری حصے میں مناتیوں اور براتیوں میں مذاق چل رہے تھے۔ دونوں جماعتیں زبان درازیوں سے نہیں، قہقہوں کے زور سے ایک دوسرے کو ہرانے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ بہت دیر تک ہنسی مذاق ہوتا رہا، لیکن آخر میں ہنسی ہنسی میں تناتنی ہو گئی —— مکھن میں گویا ریت مل گئی۔ برات میں میرے پھوپھا جی بھی آئے ہوئے تھے۔ میرے پھوپھا جی گورے، خوب صورت نوجوان تھے۔ چمپارن میں اُن کا گھر تھا۔ اُن دنوں ان کے یہاں سر پر زلف (پٹہ) رکھنے کا رواج تھا۔ شوقین نوجوان، سر پر لمبے لمبے گھنگھرالے بال رکھتے۔ جنھیں بڑی احتیاط سے کنگھی سے دو حصوں میں، بڑی صفائی سے سنوارے رہتے۔ بھیا کی سُسرال کا

گاؤں، تہذیبی لحاظ سے بہت پچھڑا تھا۔ اس میں تو شک ہی نہیں۔ پھوپھاجی کی زلف پر کسی نے ایک بھدا سا مذاق کر دیا —— پھوپھاجی شریف تھے، چپ رہے۔ لیکن ہماری جماعت والوں نے بُرا مان لیا —— ان کی توہین کو اپنے سب سے معزز مہمان کی توہین سمجھا! بات بات میں بات بڑھ گئی —— کسی نے غصے میں کہہ دیا، برات واپس لے چلو۔ پھر کیا تھا، ایک عجیب ہڑبونگ مچ گئی۔ چلو چلو اور گھیرو گھیرو کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گھوڑوں کے سوار تو گھوڑے دوڑا کے نکل گئے، پر ہاتھیوں کو لوگوں نے لاٹھیوں سے گھیر لیا۔ براتی حناتی اس طرح گڈمڈ ہو گئے کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کون کیا ہے۔ ہماری پالکی کچھ عجیب ڈھنگ سے چکر کاٹ رہی تھی۔ کبھی ایک جماعت اُسے دس گز گھسیٹ لی جاتی تو کبھی دوسری جماعت دس گز پیچھے، بےچارے کہار ہکا بکا ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی میں پالکی کے اندر سے ہی لاٹھیوں کی کھٹا کھٹ سنتا۔ یہ عجیب برات! پہلی ہی بار کا یہ انوکھا تجربہ! بہرحال، تھوڑی دیر بعد پھر سکون ہوا۔ میرے دادا بڑے ہی ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ انھیں کی کوششوں سے امن قائم ہوا۔ برات مہمان خانے میں آئی۔ سب لوگ مطمئن ہوئے، دادا کو کہتے سُنا: "بڑی جگہ پوتے کی شادی کی! بھگوان ان کی چھاپ سے اس کے بال بچوں کو بچائے!"

ہندستانی گھروں میں بھابیوں کی وہی حیثیت ہے جو ریگستان میں نخلستان کی۔ تپتے ریگزار کی لُو کی لپیٹ میں دن رات چلتے چلتے جب مسافر دور سے کھجوروں کی سرسبز پتیاں دیکھتا ہے، اُس وقت اس کی آنکھیں ہی سیر نہیں ہوتیں، اس کے

جسم کارواں رواں مسرور اور اس کی شریانوں کے خون کا ایک ایک ذرہ رقص کر اٹھتا ہے۔ چند لمحوں کے لئے اس کی ساری زندگی سرسبز ہو جاتی ہے، کھجوروں کے اس جھرمٹ میں وہ میٹھے پھل اور میٹھا پانی پاتا ہے۔ ایک آدھ دن وہیں رک کے وہ خوشیاں مناتا ہے، خون میں بالیدگی حاصل کرتا ہے، پھر تازگی اور نئی امنگ لے کے آگے بڑھتا ہے —— جہاں وہی ریگزار کا لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے۔

ہندستانی زندگی میں ہمیشہ یہ جو روکھا پھیکا پن دکھائی دیتا ہے، اس کی خاص وجہ ڈھونڈنے میں اپنا وقت برباد نہیں کروں گا۔ لیکن آپ جدھر جایئے، ادھر ادھر جدھر نظر ڈالئے اُسی کی حکومت، اسی کا دور دورہ پائیں گے۔ رُندھا رُندھا چہرہ، بے رس آنکھیں، دُبلا پتلا جسم، مرجھایا سا، مردہ سا دل۔ یہی ہے ہندستانی انسان کا عمومی خاکہ۔ جو کم بولے، ہنسے نہیں بمشکل مسکرائے، ہمیشہ اپنے ارد گرد محرمی ماحول بنائے رہے۔ اسی کی شرافت اور خلق کی تعریفیں ہوتی ہیں۔ کھیل کود میں جس کی طبیعت لگی، گانے بجانے کا جسے شوق ہوا یا ڈراما اور تفریح کی طرف جس کا رجحان ہوا۔ بس وہ لوگوں کی نظروں سے گرا۔ مانتا ہوں، ہم ہولی کھیلتے ہیں، دسہرا مناتے ہیں، دیوالی سجاتے ہیں، لیکن وہ ہماری زندگی میں فوراً گزر جانے والا ایک وقفہ ہوتا ہے۔ ہماری زندگی کے ساتھ منسلک ہے۔ بارہ مہینوں کا محرم —— نحوست، مُردنی۔

کہنے کو ہی لیجئے۔ شوہر اپنی بیوی سے بچے بچے پھرنے کی کوشش کرتا ہے —— بیوی کے شرم و حجاب کا کیا کہنا؟ چپ چوری سے ملو، ہونٹوں ہونٹوں میں باتیں کرو اور دیکھو، ہنسی گھونگھٹ یا رومال سے باہر نہ نکلے! بیٹیاں

بیٹے باپ ماں کے سامنے ہنسنا، اٹھلانا بُرا سمجھتے ہیں۔ کسی کے گھر میں اگر کوئی معمر بزرگ بچ رہے ہوں، تب تو گویا سب کے لبوں پر تالے پڑ گئے! جوان بہنیں، بھائیوں کے سامنے آنے جانے سے جھجکتی ہیں، تو بھائی بھی اُن سے الگ ہی الگ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ چھوٹے بھائی کی بیوی کا سایہ بھی بڑے بھائی پر نہیں پڑنا چاہیے۔ بہوئیں ساسوں کو دیکھتے ہی سہم اٹھتی ہیں —— جیٹھانی ساس نمبر ۲ کا کام کرتی ہے۔ جولڑکی ہنستی، کھیلتی، چہلیں کرتی یا تیزی سے چلتی ہے، اس کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے —— "تریا چنچل اتی بری" (چنچل عورت بہت ہی بُری ہوتی ہے) کیا شاعر گردھر داس نہیں کہہ گئے ہیں؟

اس طرح کی بے کیف اور غیر متحرک زندگی میں بھابی کی ہستی واقعی ریگستان میں ہرا بھرا نخلستان ہی تو ہے! اور کہیں جو کچھ بھی ہو، لیکن جہاں بھابی، وہاں تفریحیں اور بذلہ سنجیاں ہمیشہ منڈلاتی رہتی ہیں، رنگینیاں جہاں موجیں مارتی ہیں۔ نوعمر نندوں اور نوجوان دیوروں کا جمگھٹ —— ہاہا، ہاہا۔ ہی ہی۔ —— لپٹ جھپٹ، اُٹھا پٹک! چھوٹے چھوٹے بچے۔ بچیاں بھی جہاں اپنے کورس میں شرابور کرنے سے باز نہیں آتے!

بھابی آئیں، میرا گھر بھی خوشیوں کا گہوارہ بن گیا۔ بھابی ابھی نوعمر تھیں —— ان کے ہونٹوں پر پوری شادابی نہیں آئی تھی، ان کا جسم ابھی پورا ابھرا بھی نہیں تھا۔ —— لمبی، تیلی، چھڑی جیسی! لیکن سونے کی چھڑی نہیں —— یہ کہنے میں ہچکوں گا نہیں۔ ان کا رنگ دراوڑ اور آریہ خون کی آمیزش کا نمونہ تھا۔ رنگ ہی نہیں، نقشہ بھی۔ بلند پیشانی، بھوئیں کھنچی ہوئی، تیلی تیلی، سیاہ

بالوں میں گھونگھرالا پن ——— جب انھیں کھولتیں، عجیب لہردار معلوم ہوتے،
وہ ——— گردابوں سے بھری جمنا کی دھارا! ناک پیشانی کے پاس جاکے ذرا چپٹی
سی، لیکن اس کا اگلا حصہ کافی خوب صورت، دلکش! ہونٹ کچھ موٹے، لیکن ٹھوڑی
کا رسیلا پن، اس معمولی سے عیب کو ڈھک دیتا۔ اور ان ہونٹوں کے اندر سلسلہ دار
خوب صورت، چمکیلے دانت تھے! ——— جب بھابی ہنستیں، سچ مچ موتی
جھڑنے لگتے! مجھے اپنے بچپن میں تو ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔

تھوڑے ہی دنوں میں بھابی نے سب کو اپنی محبت کے دھاگے میں باندھ
لیا۔ گھر کی بڑی بوڑھیوں کے لئے بھی وہ لائق ستائش بن گئیں۔ بھابی ان کی خدمت
اور عزت کرتیں، ان کے حکموں کو سر آنکھوں پر اٹھاتیں۔ بھابی ہنرمند بھی کافی تھیں۔
وہ اچھی سلائی کرتیں، کشیدے کاڑھتیں، جب کھانا پکانے لگیں تو ان کی اور
بھی تعریفیں ہونے لگیں۔ وہ صرف اچھا کھانا تیار ہی نہیں کرلیتیں۔ بہت ہی
سلیقے سے انھیں چنتیں بھی۔ کھانا چننا بھی ایک فن ہے، بھابی نے اسے ثابت کر دیا۔
بھابی کی تعریفیں ہوتیں، بھیا کی ماں، میری چچی، پھولی نہیں سماتیں۔ ایسی حسین، سگھڑ
بہو پا کے بھلا کون سی ساس اپنے کو خوش قسمت نہیں سمجھے گی؟

بھابی کا گھر، ہم دیوروں کا تفریح کدہ تھا۔ جیوں ہی گاؤں کے پاٹھ شالے
سے چھٹی ملی، ہم دوڑتے ہوئے بھابی کے گھر میں گھسے۔ بھابی ہنس کے ہمارا استقبال
کرتیں، ناشتے کراتیں، لونگ سپاری دیتیں، جن میں منقے بھی ملے ہوتے۔ بھابی
سے پہیلیں لڑتیں، کھیل ہوتے، مذاق ہوتے، گالیاں ہوتیں، ہاتھا پائی اور جوگڑی
بھی۔ بھابی ابھی کمسن ہی تھیں، ہم کئی دیور مل کے انھیں شکست دے دیتے۔ کبھی

کبھی ہم موج میں آتے تو اُس چھوٹے سے گھر میں ہی آنکھ مچولی بھی کھیل لیتے۔ گرہست کا گھر تھا، لمبا چوڑا ——— اِدھر اُدھر، جگہ جگہ غلّے رکھنے کی مٹی کی کوٹھیاں پڑی تھیں۔ ایک کونے میں ایک بڑا کاٹھ کا صندوق تھا۔ ہم انھیں کی اوٹ میں چھپتے۔ ایک دن مجھے ایک نئی بات سوجھی۔ میں ایک کوٹھی پر چڑھ کے گھر کی موٹی شہتیر پر جا چھپا۔ بھابی گھر کے کونے کونے میں ڈھونڈ کے ہار گئیں۔ کوٹھیوں کی اوٹ میں، صندوق کے پیچھے اور نیچے، میں نہیں ملا تو انھوں نے کوٹھیوں کے پیٹ میں جھانکنا شروع کیا۔ اسی وقت میں شہتیر پر سے قہقہہ لگا اٹھا۔ وہ چونکیں، متحیر ہوئیں۔ تب تک میں کوٹھی پر ہوتا ہوا، ان کی گردن پر تھا۔ وہ مجھے لئے لئے پلنگ پر جا گریں، ہنستے ہنستے ہم دونوں کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

اسی سال جو پہلی ہولی آئی، اس کا ذکر نہ پوچھئے! بسنت پنچمی سے ہولی، ایک مہینہ دس دن تک، ہم رنگ میں شرابور تھے۔ کہیں سے کھیلتے کودتے آئے اور یا تو بھابی نے ہمارے گالوں میں ٹھوکا دے دیا یا ہم نے ان کے گالوں پر عبیر مل دی۔ خاص ہولی کے دن، پہلے تو ہم نے انھیں خوب مٹی پانی سے شرابور کر دیا اور دوپہر کے بعد تو رنگ میں جیسے بالکل ڈبو ہی دیا ہو۔ گاؤں بھر کی نندیں اور دیور آتے، سب اپنے دِلوں کے ارمان نکال لیتے۔ سب کی تواضع بھابی اسی محبت سے کرتیں۔ سب کی زبانوں پر بھابی کی تعریفیں ہوتیں۔ لوگ یہ بھول جاتے کہ بھابی اُس گاؤں سے آئی تھیں، جس کی مذمت کرتے ہوئے سبھی برائی لوٹے تھے۔

دس سال بعد کی بات ہے!

میں اب شہر میں پڑھتا ہوں۔ گھر پر گاہے گاہے جانا ہوتا ہے۔ گھر بھی وہ پرانا گھر نہیں رہ گیا ہے۔ سارا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ ایک ہی گھر میں کئی چولہے جل رہے ہیں۔ آپس میں حصہ بخرہ ہو چکا ہے۔ چچا اور بھیا بھی علیحدہ ہو چکے ہیں، بھابی بھی ہم سے الگ ہیں۔ ان کی ساس، یعنی میری چچی، مر چکی ہیں۔ اب بھابی ہی اپنے گھر کی مالکہ ہیں۔ ان کی گود میں ایک بچہ ہے —— میرا پیارا بھتیجہ۔

لوگوں کے چولھے ہی جدا نہیں ہوئے ہیں، دل بھی جُدا ہو چکے ہیں۔ نہ وہ محبّت آمیز سلوک ہے۔ نہ وہ نیک مزاجی —— سارا گھر جھگڑوں میں اُلجھا ہوا ہے۔ مرد تو دن بھر کام دھندوں میں پھنسے رہتے ہیں، الگ الگ کھیتوں کھلیانوں میں مشغول رہتے ہیں، لیکن عورتیں تو ایک ہی انگنائی میں —— بندھے ٹکے دو چار کام —— چولھا چکی وغیرہ کرتیں اور باقی وقتوں میں حقے پی پی کر جھگڑتیں۔ کھانا پکاتے وقت بھی انھیں منہ بند رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی! بس جھگڑا، جھگڑا اور جھگڑا! سارا گھر گویا جہنم بن گیا تھا۔ گھر کے کچھ بزرگ —— جیسے دادا یا بڑے چچا —— جب کھانے آتے تو کچھ دیر کے لئے جیسے التوائے جنگ ہو جاتی ورنہ جھگڑوں کا چرخہ دن رات چلا کرتا۔ ہاں نیند البتہ اس میں چند گھنٹوں کا وقفہ پیدا کر دیتی۔

اور ان جھگڑوں میں بھابی کا مقام، کچھ پوچھئے مت! خاندان اور ابتدائی ماحول کا کیا اثر ہوتا ہے، نمایاں دیکھئے! دس سال تک جو شعلہ راکھ کے نیچے دبا پڑا تھا، اچانک بھڑک اٹھا ہے! جس منہ سے کبھی پھول جھڑتے تھے،

اُف —— ! بھابی کی گالیاں — اب ان سے زہر میں بجھے تیر برستے ہیں۔ جیسے کلیجے کو بھی آر پار کر جائیں۔ عورتوں کی عزت ہونی چاہیئے، بھابی کا درجہ ماں کا ہے —— نئی روشنی کی کتابوں میں میں نے پڑھ رکھا تھا۔ لیکن میں بھی ایک دن صبر کھو بیٹھا۔ میں ہمیشہ گھر کے اِن جھگڑوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا پھر، میں بھابی کے بچے کو دن بھر کندھے پر لیئے پھرتا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ بھابی کے تیروں کا نشانہ مجھے بھی بننا پڑے گا۔ لیکن، یہ کیا؟ اس دن میں کھانے گیا۔ دیکھا انگنائی میں کہرام مچا ہے۔ میں نے دھیمے سے بھابی سے کہا۔ —— تھوڑی دیر مہربانی کیجیے، پھر اس گھر کو جہنم تو رہنا ہی ہے۔ بس پھر کیا تھا، بھابی برس پڑیں اور یکے بعد دیگرے ایسے تیر پر تیر "تاک تاک کے سینے پر مارے کہ میں آپے میں نہیں رہا۔ غصّے سے پاگل ہو کے، بدحواسی میں کیا کچھ کرنے جا رہا تھا، یہ تب پتہ چلا جب دیکھا، بھیّا مجھے پکڑے ہوئے ہیں اور بھابی کمرے میں کواڑ بند کیے چیخ رہی ہیں۔

ایسا نہیں کہ بھیّا مجھ سے جھگڑ رہے تھے یا بھابی پر میں نے ہاتھ چھوڑا تھا۔ مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ، پہلے تو انھوں نے طعنوں پر طعنے دیئے، گویا میں ان طعنوں سے رُک جاؤں گا، پھر بھاگ کے گھر میں بند ہو گئیں اور زور زور سے چلانے لگیں، جیسے میں نے انھیں پیٹا ہو۔ ہنگامہ سُن کے بھیّا دوڑے آئے تھے اور اب مجھے آنگن سے باہر لے جانے کی کوشش میں تھے۔ بلاشبہ، میں اپنے اس غصّے پر شرمندہ تھا۔ اگر بھابی نے اپنا بچاؤ نہ کیا ہوتا، وقت پر بھیا نہیں آ گئے ہوتے، تو مجھ سے کوئی ناقابلِ معافی جرم سرزد ہو گیا ہوتا۔

اور اس کا اثر گھر بھر پر کیا پڑتا، کہہ نہیں سکتا!

لیکن اس واقعہ سے میں نے ایک سبق سیکھا۔ جیوں ہی گھر کا انتظام میرے ہاتھوں میں آیا، میں نے اپنے اہل و عیال کو اس گھر سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ الگ مکان بنایا اور اس میں چلا گیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں میں نے دیکھا، بھابی کوئی معمولی عورت نہیں ہیں۔ وہ اکثر وہاں آ کے بھی اپنے دل کا بخار اتارا ہی جاتی ہیں۔ کیا گاؤں ہی چھوڑ دینا پڑے گا؟ —— کبھی کبھی میں سوچتا۔ اور شاید وہی کرتا بھی، اگر ایک اور بات نہ ہوتی، اور خاص کر اسی بات کے لئے یہ سطریں لکھ رہا ہوں، ورنہ اپنی جانہار بھابی کی جگ ہنسائی کے لئے اپنا قلم اٹھانے سے پہلے، اُسے توڑ ڈالنا میں زیادہ پسند کرتا!

وہ قلم ٹوٹ جائے جو صرف مذمت کے لئے اٹھتا ہو!

ہمارے ایک دوست ہیں —— ایک اڈیٹر دوست۔ کٹر قوم پرور، اور میں ہوں اشتراکی۔ اس لئے ایسے موقعے آتے ہیں کہ ہم سے ناراض ہو کے اپنے اخبار کے کالموں کو ہمیں کھری کھوٹی سنانے میں صرف کرتے ہیں۔ ان کی بے رحم تنقیدیں —— اُف! ہم تلملا اٹھتے ہیں!

لیکن یہ دیکھا ہے، جیوں ہی انگریزی حکومت نے ہم پر حملہ کیا، یا کسی رجعت پسند اخبار نے ہماری مذمت کی بس، ان تنقیدوں کی بیڑی اس طرف مُڑی۔ گویا ان کی منطق تھی —— یہ ہمارے ہیں۔ ہم گالیاں دیں یا چمکاریں، تم کون ہوتے ہو اُن کی طرف آنکھ اٹھانے والے؟ آنکھ اٹھاؤ گے، تو اسے پھوڑ دوں گا! ہاں کچھ اسی جوش و خروش سے وہ ٹوٹتے ہیں ان پر! اور یہ کہنا تو فضول ہی ہے کہ ذاتی

سُکھ دُکھ میں وہ اس طرح ہمارے شریکِ حال ہوتے ہیں کہ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا، وہ ہمارے سخت ترین نقاد بھی رہ چکے ہیں۔

میری بھابی کا بھی یہی حال تھا۔

وہ ہمیں گالیاں دیتیں، ہم سے جھگڑتیں، ہماری زندگی حرام کیے رہتیں، لیکن مان لیجیے، وہ بک جھک کر رہی ہیں اور انھیں خوش کرنے یا اور ابھارنے کے لیے کوئی عورت بیچ میں ٹپک پڑی، ہمیں کھری کھوٹی سنانے لگی۔ پھر کیا ہے، بھابی جھٹ اس پر الٹ پڑیں ——— "کس نے تمھیں کہا ہمارے بیچ میں پڑنے کو؟ وہ بُرے ہیں، اور تم؟ ——— ہٹو میرے سامنے سے، سُوپ ہنسے چھلنی کو" جس میں بہتر چھید! میں تمھیں نہیں جانتی کیا؟ ڈائن کہیں کی! لیکن مجھ پر تمھارا ڈائن پن نہیں چلے گا۔ میں نکال لوں گی آنکھیں، کھینچ لوں گی زبان! ......

اوچھا بلا کے ننگی نچواؤں گی ——— میرے میکے میں ہے ایک اوجھا جسے دیکھتے ہی ڈائنیں کپڑے کھول دیتی ہیں۔ ہاں! ——— وہ بُرے ہیں، تو تمھارا کیا بگڑتا ہے۔ میں سمجھ لوں گی اُن سے۔ میں کمزور تھوڑی ہی ہوں جو کسی کی مدد لوں گی۔ نکلو یہاں سے .... اسی طرح نہ جانے کیا کیا بکنے لگتیں۔ وہ بیچاری ششدر، چُپ، رفو چکر ہو جاتی ورنہ جھگڑا ہم سے چھوٹ کے اسی سے شروع ہو جاتا۔ اور زبان درازی میں ان سے کون پار پا سکتا تھا۔

پھر جیوں ہی کوئی برت یا تیوہار آیا کہ عارضی صلح ہو گئی۔ یوں تو بھابی کا جسم اس طرح گٹھا ہوا تھا کہ وہ ہمیشہ ہی اپنی عمر سے چھوٹی معلوم ہوتیں ——— چالیسویں سال میں بھی چہرے پر روغن، دانتوں میں چمک، سینے پر ابھار، چال

میں مستی تھی۔ لیکن برت تیوہاروں میں خصوصاً اپنا بناؤ سنگار کرنے سے کبھی نہیں چوکتیں۔ ہولی میں تو جیسے پاگل ہو جاتیں۔ اپنے ادھیڑ، متفکر دیوروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے بلاتیں، ان سے ہاتھا پائی کرتیں، کیچڑ سے انھیں لت پت بناتیں اور پھر نہانے دھونے کے بعد ان پر عبیر اور ابرک ڈالتیں۔ ایسی ایک بھی ہولی مجھے یاد نہیں، جبکہ بھابی کے ہاتھوں مٹی، پانی، عبیر اور ابرک پانے اور مال پوئے، گلگلے کھانے کا موقع نہیں ملا ہو۔ بھابی اب بچوں کو ہولی کھیلنے دیجیے۔ ہم آپ دیکھا کریں! بھابی بولیں —— واہ بوا، جوانی ڈھل گئی تو کیا من بھی ڈھل گیا؟ بچے اپنی ہولی کھیلیں ہم اپنی کھیلتے ہیں —— ان کے اپنے دل، ہمارے اپنے دل! اُن کا رُواں رُواں ہنس رہا تھا۔

اور بچوں سے انھیں کتنی محبت تھی؟

ان جھگڑوں اور فسادوں کے درمیان بھی وہ میرے گھر آتیں اور میرے بچوں کو اُبٹن، تیل اور کاجل لگا جاتیں، انھیں گود میں لے کے کھلاتیں، ہنساتیں۔ ایک بار دیکھا، میرے بچے کو گود میں لیے اس کی ماں سے جھگڑ رہی ہیں اور جیوں ہی بچہ روٹھا، فوراً اپنا دودھ اس کے منہ میں دے دیا۔

ایک دن، اسی طرح، ان کا جھگڑا میری رانی سے چل رہا تھا کہ میرے بڑے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ جھگڑا چھوڑ، یہ کہتی ہوئی دوڑیں —— کس نے میرے بچے کو مارا؟ باز کی طرح جھپٹیں اس طرف اور میں نے دیکھا، بچے کو لیے دوڑی آ رہی ہیں۔ بچہ زور زور سے رو رہا تھا۔ اسے بھڑنے ڈنک مارا تھا۔ بچے کو میری رانی کی گود میں رکھ، دوڑتی ہوئی گئیں، مٹی کا تیل لے آئیں۔ گیندے کی پتیاں لے آئیں

اور جہاں پر ڈنک کا نشان تھا، وہاں لگا دیا ——— یہی دیہاتی دوا تھی۔ بچہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ڈنک زیادہ زہریلا تھا۔ اسے بخار آگیا۔

جب تک بخار رہا، بھابی اپنا اور میرا گھر آنگن ایک کئے رہیں۔ ایک وقت تو ان کے گھر میں چولھا تک نہیں جل سکا۔ بھیا ہنستے ہوئے آئے اور میری رانی کی طرف مخاطب ہو کے کہا ——— "جھگڑا ہو تو ایسا، میرا کھانا تک بند ہو گیا۔" بھیا نے کھانا میرے ہی گھر پہ کھایا۔

اسی لئے، آج جبکہ بھابی نہیں رہیں، میری رانی اپنے کو، ان کے دونوں بچوں کی منہ بولی ماں سمجھتی ہے اور ان دونوں کی شادیوں میں اس نے کیا کیا نہ کیا! بھابی تھیں تو جھگڑا تھا، ان کی یاد نے ان جھگڑوں کو محبت میں تبدیل کر دیا ہے۔

میں جب ان اڈیٹر دوست کے پاس جاتا ہوں، خواہش ہوتی ہے، ان کے قدم چھو لوں۔ عمر میں مجھ سے بزرگ بھی ہیں۔ اور جب جب بھابی کی یادیں آتی ہیں۔ دونوں ہاتھ مل کے میرے سر سے جا لگتے ہیں ——— بدنام بھابی!

پرمیسر

اس دن اپنے دفتر میں کاغذوں کے ڈھیر اور کام کی بھیڑ میں بیٹھا تھا کہ شری رام گاؤں سے آیا اور خیریت پوچھنے پر بولا ——— پرمیسر بیمار ہے ——— لب جان۔ جانے بے چارہ بچتا ہے کہ نہیں!

پرمیسر میری پٹی داری کا ہی ایک فرد ہے، لیکن اس سے اتنی زیادہ قربت نہیں ہے اس کے علاوہ اس میں عیوب بھی کچھ ایسے ہیں جنھیں دیکھتے ہوئے، اس کے لئے کام کاج چھوڑ کر دوڑے دوڑے بیتی پور جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پرمیسر فضول خرچ ہے، آوارہ ہے۔ سارے گھر کو اس نے برباد کر دیا۔ قرض پر قرض لیا، آبائی زمین بیچ دی اور آخر میں، اُس سال، اس نے اپنی بیوی کے زیور تک بیچ کے گانجے میں پھونک دیا۔ اُس نے میرے خاندان کی عزت میں بٹا لگایا ہے، اپنے گھر والوں کو مصیبت اور تباہی میں ڈالا ہے، خود بھی اب پریشان حال مارا مارا

پھرتا ہے۔ کمبخت مرے، ایسے آدمی کا مر جانا ہی ٹھیک ہے ——— میں نے اسی طرح کے بہلاووں سے اپنے دل کو تسکین دی اور پھر کام میں لگ گیا۔ لیکن جیوں ہی شام ہوئی، کام کی بھیڑ چھنٹی، کچھ مطمئن ہوا کہ پرمیسر کا خیال پھر آیا اور میں رات ہی کے اسٹیمر سے گھر کے لئے روانہ ہو گیا۔

یہی ہے پرمیسر کا گھر۔ پرانے کشادہ مکان کے بدلے یہ رام مڑیّا ——— ایک ہی رام مڑیّا۔ وہی باورچی خانہ، توشہ خانہ، خواب گاہ۔ اسی میں اس کی ماں بھی اور بیوی بھی۔ بھائی بھی، بال بچے بھی، بوڑھے باپ سائبان کے ایک کونے میں اور دوسرے کونے میں پرمیسر پیال پر پڑا ہے۔ ایک پرانی، پھٹی نچی دوہر سے ہوا کو روکنے کے لئے آڑ کر دی گئی ہے، اسے خطرناک مرض نے پکڑا ہے ———

اسہال! ۱۰۴ ڈگری کا بخار اور دست پر دست ہوتے چلے جا رہے ہیں بسارا ماحول گندگی اور بدبو سے معمور۔ پھر بھی بے چاری ماں خدمت میں لگی ہے۔ بوڑھا باپ آہ و زاری میں مبتلا ہے اور بے چاری بیوی ایک کونے میں سمٹی سمٹائی سہمی ہوئی سسک رہی ہے!

اسہال کیوں ہوا؟ ——— اِدھر کھانے پینے کی دقّت تھی۔ کئی وقت کا بھوکا تھا۔ ایک صاحب شکر قند کھو رہے تھے، ان کے پاس ہنستا ہوا گیا اور ہنسی ہنسی میں کچھ شکر قند بھر پیٹ ٹھونس لئے! وہ شکر قند ہضم نہیں ہوئے، دست آنے لگے، بخار آگیا۔ وہ نیم بے ہوش پڑا ہے، کبھی کبھی مشکل سے آنکھیں کھلتی ہیں ——— آنکھیں ——— جو دھنس کے حلقے میں نہیں، بالکل گڈھے میں، چلی گئی ہیں۔

تنبیہہ کا وقت نہیں تھا۔ پاس کے آیورویدا ہسپتال کے ویدجی کو بُلوایا، انھوں نے دیکھا دوا دی، لیکن چپکے سے مجھے کہہ گئے ——— قرینے اچھے نہیں ہیں، رات کٹ جائے تو کچھ امید بندھے۔ وہ رات نہیں کٹی۔ پرمیسر چلتا بنا ——— گھر والوں کو رُلا کے، گاؤں والوں کو افسوس میں ڈال کے۔

گاؤں والوں کو صرف اسی دن افسوس نہیں ہوا۔ جب جب دسہرا۔ ہولی۔ دیوالی جیٹھ یا کارتک پورنیما آتی ہے، پرمیسر کے لئے ٹھنڈی سانسیں لی جاتی ہیں۔ بلاشبہ پرمیسر آوارہ تھا۔ لیکن اس کی آوارہ گردی ایک ایسی آگ تھی جو خود کو ہی جلاتی ہے ——— خود کو جلاتی ہے، لیکن دوسروں کو روشنی اور گرماہٹ دیتی ہے۔ بچپن میں ہم سبھوں کے ساتھ پڑھنے بیٹھا۔ تیز تھا، پر پڑھا نہیں۔ بڑا ہوا، گورا چھریرا نوجوان، ایک اچھے گھر میں شادی ہوئی اس کی۔ حسب معمول بچے بھی ہوئے۔ اس کے پتا بالکل سادہ لوح انسان تھے، اس لئے بڑا ہوتے ہی گھر کا مالک بن بیٹھا۔ گھر کی باگ ڈور ہاتھ میں آتے ہی من کی ڈور ڈھیلی کر دی ——— من کی اور ہاتھ کی بھی۔ روز ہاٹ بازار جاتا۔ جب تب شہر بھی جاتا اور ہر میلے میں تو ضرور ہی جاتا۔ موقع ملنے پر تیرتھ کی دوڑ بھی لگا آتا۔ اس کے حسب حال کچھ دوست بھی ملے اسے۔ گانجے کے دم لگنے لگے۔ آبائی جائداد کا صفایا ہونے لگا۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا جبکہ پرمیسر بالکل مفلس تھا۔

لیکن، یہ مفلسی اس کے مزاج میں تبدیلی نہیں لا سکی۔ گانجا چھوٹا۔ بھنگ کی چلم چلنے لگی۔ میرے علاقے میں بھنگ کو کوئی پوچھتا نہیں۔ اِدھر اُدھر،

ہر جگہ اس کا جنگل سا اگا رہتا ہے۔ پر مبیسر اس جنگل سے خوب دبیز پتیاں چن کے لاتا، سکھاتا اور حفاظت سے رکھتا۔ خود پیتا، یاروں کو پلاتا۔ اس کے دروازے پر ہمیشہ ایک ڈھول اور کئی جوڑے جھال بنا رہتے۔ شام ہوئی نہیں کہ پرمبیسر کی رام مڑیا گلزار ہوئی۔ بارہ مہینے، چوبیس پکھوارے، اس کے دروازے پر منگل مچتا۔ بھلے ہی کئی وقت بھر پیٹ کھانا نصیب نہیں ہوا ہو، لیکن اس کے گانے بجانے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ رنگین مزاج! دروازے پر چند پھول کے پودے ضرور لگے ہوتے۔ اور ایک بڑا، گاؤں بھر سے اونچا، مہابیری جھنڈا ہمیشہ لہراتا رہتا وہاں۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اس کی مذمت کرتے، نکتہ چینی کرتے گالیاں دیتے، لیکن بچوں اور نوجوانوں کا جھنڈ ہمیشہ اس کے آگے پیچھے دوڑتا پھرتا۔

کھیت میں سرسوں پھولی نہیں کہ پرمبیسر کی ہولی پہنچ گئی! سرسوں کا پہلا پھول دیکھتے ہی پرمبیسر ہولی گانا شروع کر دیتا۔ اور جس دن بسنت پنچمی ہوتی، اس دن سے تو جیسے، اسے بدمستیوں کا لائسنس مل جاتا۔ پیٹ کاٹ کے پیسے بچا رکھتا، ان دنوں کے لئے! دف پر نیا چمڑا چڑھوایا جاتا، جھال میں نئی ڈوریاں لگائی جاتیں، ڈھول پر نیا گدلا لایا جاتا۔ شام سے جو ہولی شروع ہوتی، آدھی رات کے بعد تک ہاہا، ہوہو سے گاؤں میں ہنگامہ برپا رہتا۔

اور عین ہولی کے دن؟

صبح سے ہی پرمبیسر کے دروازے پر تیاریاں دیکھیے۔ کہیں سے کسی طرح بھینس کا دودھ اوپر کرتا۔ چینی نہیں تو گڑ ہی سہی۔ بڑی سل پر بھنگ کی پتیاں ڈھیر کی

ڈھبر پیتیا، پسواتا۔ انھیں پانی، دودھ اور گڑ میں ملاتا، خود چھک چھک کے پتیا، دوستوں کو پلاتا! پھر انھیں ساتھ لے کے گاؤں میں نکلتا۔ چاہے بزرگ ہوں یا چھوٹے بچے —— جو اس کے سامنے آئے، اُن پر کیچڑ پڑی۔ کوئی ناراض ہو یا گالیاں دے، پرمیسر کو اس کی کیا پروا؟ ہولی کے دن کی گالیاں تو دعائیں ہوتی ہیں نہ؟ گاؤں بھر کولت پت کر کے وہ شاہراہ عام پر آتا جو راہ گیر اس دن میرے گاؤں کی سرحد سے نکلا اس کی بس درگت ہی سمجھئے۔ کیچڑ، گوبر، پانی —— بس سر سے پاؤں تک اسے نہلا دیا گیا اس کیچڑ اچھال میں عجیب دھما چوکڑی مچتی۔ کوئی اِدھر بھاگا جا رہا ہے کوئی اُدھر دوڑ رہا ہے۔ للکاریں دی جا رہی ہیں۔ ہنسی کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ اس طرح دوپہر ہوئی۔ تب سب تالاب پر پہنچے۔ وہاں خوب تیراکی اور غوطہ زنی ہوئی تب گھر۔

کھانا کھا کے پرمیسر کی ہولی منڈلی تیار ہو گئی۔ پرمیسر اپنے ہاتھ میں دف لیتا۔ نشے سے آنکھیں سُرخ۔ اور عبیر سے اس کے چہرے اور جسم ہی کی کیا بات، سر کے بال تک سُرخ ہوتے۔ بیچ میں پرمیسر کا دف —— چاروں طرف جھالی کرتال اور جھانجھ لئے گانے بجانے والے، جنھیں تماشائیوں کا ہجوم گھیرے رہتا۔ پرمیسر کیا صرف دف ہی بجاتا؟ ہاں اس کے ہاتھ تال پر دف پیٹتے جاتے، لیکن اس کا تو گویا انگ انگ گا بجا رہا ہوتا! اچھلتا، کودتا ناچتا، ہاہا کرتا —— پرمیسر صرف نام کے لئے مرکز میں نہیں ہوتا، بلکہ وہ انگ انگ میں مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ گاؤں کے امیر غریب سب ہی کے دروازوں پر گاتا بجاتا سوانگ بھرتا اور آخر میں شیو مندر جاتا، وہاں سے کافی رات گئے، چیت گاتا ہوا لوٹتا۔

پرمیسر کے بعد بھی گاؤں میں ہولی ہوتی ہے، لیکن ویسا رنگ کہاں جم پاتا ہے؟

یوں ہی دسہرے کی دسوں راتوں کو وہ گاؤں بھر میں ہنگامہ مچائے رہتا ہے میرے گاؤں میں ان دسوں راتوں کو اوجھا لوگوں کے ذریعے بھوت کھلانے کا رواج تھا۔ یہ رواج اب قریب قریب ختم ہو رہا ہے۔ لیکن اس مرتے ہوئے رواج میں پرمیسر نے گویا نئی جان ڈال دی تھی۔ اپنے دروازے پر گاؤں بھر کے اوجھاؤں کو دعوت دے کے بلا لیتا۔ بیچ میں دھوپ جل رہی ہے۔ دھوپ کے سامنے ساتوں بہن درگا کے نام پر سات جگہ چاول، سیندور اور گڑہل کے پھول ایک قطار میں رکھ دئے گئے ہیں۔ اس قطار کے سامنے بید کی لال چھڑی ہے۔ اوجھا گیت گا رہے ہیں جھانجھ بجا رہے ہیں، گیت کا سُر اٹھان کی آخری چوٹی پر پہنچا نہیں کہ ان میں سے کسی نہ کسی کے سر پر کوئی بھوت۔ برہم، چڑیل، دیوی وغیرہ کئی ذاتیں ہیں ان کی۔ آ گیا۔ بھوت آتے ہی اوجھا بدن ہلانے لگا، پہلے آہستہ آہستہ پھر زور زور سے۔ بدن ہلاتے ہلاتے اس نے بید اٹھالی اور اس بید سے اپنے جسم کو تڑاتڑ پیٹنے لگا۔ اوجھا بید سے اپنے جسم کو پیٹے جا رہا ہے اور لوگ کہہ رہے ہیں ——— دیکھو مہاراج گھوڑا کمزور ہے، زیادہ نہ پیٹو۔ بڑی آرزو منت کے بعد بھوت مہاراج کو رحم آیا تو چھڑی پھینک، کہنی زمین پر پٹکنے لگے ——— یہاں تک کہ زمین کھود دی۔ بتی جلا کے منہ میں رکھی جاتی ہتھیلی پر دہکتی آگ رکھ لینا وغیرہ کرتب دکھائے جاتے اور آخر میں بھیٹی ٹھیکی، جاتی، دل کی مرادیں کہی جاتیں، ان کے بر آنے کی برکتیں بتا کے بھوت چل دیتا! بھوت آتے ہی تماشائیوں میں کھلبلی مچ جاتی ——— عجیب عجیب سوالات کئے جاتے، چیزیں مانگی جاتیں۔ پرمیسر کے ہاتھ میں گویا بھوتوں کی لگام ہو ——— جس اوجھا سے، جس بھوت کو چاہتا وہ بلوا سکتا تھا۔

کبھی کبھی وہ خود اپنے اوپر بھی بھوت بلاتا۔ اس کے بھوت عجیب قسم کے ہوتے، نئے ناز و انداز دکھاتے، نئی بولیاں بولتے اور ان کے ایسے آشیرواد ہوتے کہ لوگ سنتے ہی لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ عموماً پرمیسر کے بھوت پر ہی مجلس ختم ہوتی —— کیونکہ وہ کھاؤں کھاؤں کر کے لوگوں پر —— خاص کر بچوں پر، ٹوٹتا! بھگدڑ مچ جاتی —— لوگ ہنستے ہنستے، پرمیسر کے گن گاتے گھر لوٹ جاتے۔

دیوالی چاہے کوئی سجائے 'لوکاٹھی' بھانجنے کا انتظام وہ کرتا۔ بانس کے سوکھے کونپل اکٹھے کر کے انھیں بانس کی ہی قمچیوں میں گوندھ لیتا اور شام ہوتے ہی ان میں آگ لگا کے اپنی منڈلی کے ساتھ سارے میدان کو جگمگ کر ڈالتا۔ یونہی ہولی کے 'ہولیکا دہن' کا انتظام بھی وہی کرتا۔ گاؤں بھر کے پیال، سرکنڈے ڈنٹھل وغیرہ اکٹھا کر کے پہاڑ سا کھڑا کر دیتا۔ جو لوگ آسانی سے نہیں دیتے ان کی چیزیں چوری بھی کرا لیتا اور انبار میں ڈال دیتا۔ عموماً وہ خود ہی اس میں آگ لگاتا اور مختلف طریقوں سے اسے جلاتا، بجھاتا!

کارتک پورنیما —— بس، پرمیسر اپنی منڈلی کے ساتھ گنگا اشنان کو چلا۔ اسٹیشن پر آیا، ٹکٹ کون لیتا ہے! جب پیسے رہے تب ٹکٹ لینا اس کی شان کے خلاف تھا اور اب تو پیسے اکثر رہتے ہی نہیں تھے۔ راستے بھر ٹکٹ چک کرنے والوں سے آنکھ مچولی ہو رہی ہے۔ اسٹیشن پر پہنچنے سے پہلے جونہی گاڑی دھیمی ہوئی کہ رفو چکر —— اتفاقاً اگر اسٹیشن پر پہنچ بھی گیا تو تار کے گھیرے چھلانگ کر نکل گیا۔ کبھی دھینگا مشتی کی نوبت آ گئی تو کبھی مار پیٹ بھی ہو گئی۔ پرمیسر کے خیال میں 'ملکش' کو پیسے دے دینے کے بعد گنگا اشنان کی کوئی اہمیت

ہی نہیں رہ جاتی!

پلہیزا گھاٹ سے لے کے سون پور کے میلے تک پر میسر کیا کیا تماشے نہ کرتا۔ کبھی سر پر تری پنڈ، چندن کیے، گنگا کنارے وہ اشنان کرنے والوں کو ——— دسوبھل، پڑھا رہا ہے۔ کبھی منڈلی کے بیچ میں پرمہنس، سادھو بنا بیٹھا، لوگوں کی مراد بر آری کے لئے بھبھوت بانٹ رہا ہے، کبھی وہ اوجھا بنا، بہتیری اولاد کی خواہش مند عورتوں کی گودیں بھر رہا ہے! ان تماشوں سے جو پیسے مل جاتے اُن سے منڈلی بھر میں مٹھائیاں بٹتیں، گانجے اُڑتے۔ ان تماشوں میں مکاری کا کہیں ارادہ نہیں ہوتا، اگر ہوتا تو بس دل لگی اور تفریح کا خیال۔ مکاری تو اس میں تھی ہی نہیں ——— اگر یہ ہوتی تو بے چارے کی یہ دُرگت کیوں بنتی؟ وہ ان لوگوں میں تھا جو دنیا میں ہنسنے ہنسانے کے لئے ہی آتے ہیں اور ہنستے ہنساتے ہی چل بستے ہیں۔

ادھر آخر میں جب اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی، ایک دن میں نے اسے بلا کے بہت سمجھایا تھا ——— کیوں جی یہ کیا کر رہے ہو؟ اگر اپنی طرف نہیں دیکھتے تو باپ ماں کا خیال کرو۔ یہ بھی نہیں تو بال بچوں کی ہی ذمہ داری سمجھو۔ تم کوئی احمق نہیں ہو، تم میں کافی عقل ہے۔ سمجھ ہے ——— اس سے کام لو! کھیتی باڑی میں جی نہیں لگتا، تو کوئی دوسرا روزگار دیکھو۔ شہر میں کوئی چھوٹا سا ہوٹل ہی کھول دو۔ کھا پی کے کچھ پیسے بچ ہی جائیں گے۔ میں نے کئی ایسے آدمیوں کی مثالیں بھی دیں جو ایسے ہی چھوٹے چھوٹے روزگاروں سے اپنی اور اپنے گھر والوں کی پرورش

کر رہے تھے۔ اس وقت تو کچھ نہیں بولا ـــــــ کچھ دنوں بعد سنا، پرمیسر نے اکھاڑا گھاٹ پر ایک ہوٹل کھولا ہے اور اُس ہوٹل کے لئے، اس کے پاس ـــــــ نہیں نہیں اس کی بیوی کے پاس ـــــــ جو آخری دولت ـــــــ سونے کا طوق تھی، اُسے بیچ ڈالا ہے۔

طوق بیچنے کی خبر سُن کے میں چونکا، لیکن پھر سوچا، شاید یہی اس کی ہمت بندھا کے اسے ترقی کی طرف لے جائے۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ لیکن میرا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔ کچھ ہی دنوں تک اس کا کاروبار اچھا چلا، لیکن ہاتھ میں پیسے آتے ہی، پھر بھنگ کی جگہ گانجے نے لے لی اور ایک وجہ تو اس نے عجیب ہی بتلائی۔

چاچاجی، کھلانا تو بڑا اچھا لگتا ہے۔ لیکن کھلانے پلانے کے بعد کُتّا ہوں، کی طرح، پیسوں کے لئے پیچھے پڑ جانا، یہ تو بڑا کٹھن کام ہے، اس میں شک نہیں کہ کچھ پیسے میں نے گانجے میں پھونکے، لیکن میرے زیادہ پیسے تو کھانے والوں کے ذمے ہی رہ گئے! اچھا، کیا ہوا ـــــــ اُس جنم میں وہ تاڑ کے پیڑ ہوں گے اور میں بیل بن کے اُن کے سینے پر اُگوں گا! خوب وصول کروں گا، ان سے۔ کیا خیال ہے، چاچاجی؟" وہ ہنس رہا تھا ـــــــ کھِل کھِل کھِل۔

چاچاجی غصّے میں بولے ـــــــ "اور اُس بیچاری کا طوق بھی تم نے برباد کر دیا۔"

"طوق کیا ہوگا؟ آپ ہی کہتے ہیں، اب تو سب لوگ برابر ہوں گے نہ؟ سب کے پاس طوق ہوں گے، تو کیا آپ لوگ اسے بھی نہیں بنوادیں گے؟ اور آپ لوگوں کا راج نہ بھی ہو تو کریا مسٹر کی جورو کون سا طوق پہنتی ہے؟ چاچاجی

سکھ ملتا ہے یا تو تقدیر سے یا محنت سے ۔ محنت مجھ سے ہوتی نہیں ، تقدیر اچھی نہیں ——
پھر بھنگ پی کے ہا ہا ، ہی ہی کرنا اور اسی ہنسی خوشی میں زندگی گزار دینا —— بس
یہی مجھ سے ہوگا ۔ میرے لئے فکر نہ کیجئے ...."

میں غصے میں چور اسے کچھ کہنے والا ہی تھا کہ وہ آہستہ سے اٹھا اور ہنستا ہوا
—— مالک ہیں سیارام ، سوچ من کا ہے کرے —— گاتا ہوا
چلتا بنا ،

گویا میری عقلمندی پر طنز کر رہا ہو !

بیجو ماما

آج بھی میرا خیال ہے، اگر آپ پٹنہ جیل میں جائیں اور کسی پرانے قیدی، وارڈر یا جمعدار سے بیجو ماما کے بارے میں پوچھیں، تو ایک عجیب ڈھنگ کی ہنسی ہنس کے، آپ کو ان کی ایک دو کہانیاں ضرور سنائے گا۔ بیجو ماما جیل کی ایک خاص چیز ہیں۔ تقریباً تیس سال سے وہ اس جیل کو آباد کئے ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۷ء، سنہ ۱۹۳۸ء اور سنہ ۱۹۴۰ء، جب جب میں پٹنہ جیل میں پہنچا ہوں، تب تب ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اُن سے باتیں کی ہیں، خوب ہنستا ہوں اور ہر بار کی ہنسی کے بعد ایک عجیب قسم کے رحم کا احساس ہوا ہے مجھے۔

جب میں نے کہا کہ وہ تیس سال سے اس جیل کو آباد کئے ہوئے ہیں، تو آپ نے یہی سوچا ہوگا۔ یا تو وہ کوئی دائمی قیدی ہیں ——— خون کر کے آئے ہیں، ڈاکہ ڈال کے آئے ہیں۔ یا کوئی شہدہ یا زانی ہیں، یا کم سے کم عادی مجرم تو

یقینی ہیں۔

لیکن میں ان سبھی الزاموں کی دعوے کے ساتھ تردید کر سکتا ہوں۔ ان کے چہرے یا چال ڈھال، کسی سے بھی ان میں آپ خونخوار یا مجرم ہونے کی کوئی علامت پا نہیں سکتے۔ پھر بھی وہ جیل میں ہیں اور تیس سال سے ہیں۔ کس قدر حیرت انگیز؛

وہ ہر بار ایک ہی جرم میں آتے ہیں، جس میں ایک قسط میں دو سال قید سے زیادہ کی سزا انھیں نہیں ملی ہے۔ جیوں ہی چھوٹ کے جاتے ہیں، اسی جُرم کو دہراتے ہیں اور پھر ایک دو سال کی سزا لے کے پہنچ جاتے ہیں۔ وہ جرم کیا ہے؟ چوری! آپ سوچیں گے وہ یقینی پکے چور ہو گئے ہوں گے، انھوں نے کوئی گروہ بنا لیا ہوگا، بڑے پیمانے پر ہاتھ مارتے ہوں گے، جس طرح جیلوں میں دو ایک مرتبہ آکے معمولی چور بھی استاد بن جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اس مرتبے کے چور ہوتے تو مجھے ان کے بارے میں لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی! مجھے جُرمیات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے کہ اس سلسلے میں تجسس و تفحص کرتا!

بجو ماما کچھ عجیب قماش کے چور ہیں۔ چوری کے جرم میں تیس سال سزا بھگت چکے ہیں، لیکن ابھی تک وہ تیس روپے بھی ایک بار کبھی نہیں پا سکے ہیں؛ ورنہ انھیں کے قول کے مطابق، آپ انھیں جیل میں نہیں پاتے۔ اور کبیر کے دوہے کے مطابق ————

"سنہن کے لینہڑے نہیں، ہنسن کی نہیں پانت
لالن کی نہیں بوریاں، سادھو نہ چلے جمات"

انھوں نے آج تک کوئی جماعت بھی نہیں بنائی! تو کیا وہ سچ مچ سادھو

ہیں؟ توبہ توبہ، میں ایک پرانے چور کو سادھو کہوں گا؟ ایسی، اتنی بڑی گستاخی کرکے میں سادھو سماج کو کونسا منہ دکھلاؤں گا!

میں اعلیٰ درجے کا قیدی تھا۔ اس جیل میں ایسے لوگوں کے لیئے کوئی خاص آرام دہ جگہ نہیں ہونے کی وجہ سے، مجھے اسپتال میں ہی رکھا گیا تھا۔ ایک دن میں اسپتال کے ہی باغیچے میں، آم کے ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں بیٹھا قلم گھس رہا تھا کہ دیکھا، ایک بوڑھا مریض، کمبل اوڑھے اسی طرف آرہا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے آیا، کمزوری کی وجہ سے ڈگمگاتا ہوا، پھولوں کی کیاری میں بیٹھ گیا۔ پھر ایک بار حسرت بھری نگاہوں سے اس نے چاروں طرف دیکھا اور کمبل کے نیچے سے ایک کھرپی نکال، وہ آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر اُگی ہوئی گھاس کو صاف کرنے لگا! وہ تھوڑی ہی دیر گھاس کی 'نکوئی' کر پایا ہوگا کہ اسپتال کا 'میٹ' ہاتھ میں دوا کی پیالی لیئے، اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا اور اُسے 'نکوئی' کرتے دیکھ، بوکھلا اٹھا ——— ماموں! تم اس بار مر کے رہوگے!

بوڑھا قیدی سپٹا گیا۔ کھرپی چھوڑدی، کمبل سنبھالا اور بہ منت میٹ سے کہا ——— معاف کرنا بھیا، دوا دو!

دوا دوں، خاک! دوا کھاکے کیا ہوگا؟ تمھیں کیا پڑی ہے بھلا، جو کھرپی لے کے آبیٹھے ہو یہاں؟ جائے بھاڑ میں یہ باغیچہ!"

"ہیں ہیں، یہ کیا کہتے ہو؟ دیکھتے نہیں، چار دنوں میں بیمار رہا اور اتنی

گھاس پھوس اُگ آیا!"

"ماموں، تو قیدی ہے یا سرکار کا بیل؟ پرانے قیدیوں کی شان تو نے مٹی میں ملا دی! کیا ہم جیلوں میں کام کرنے آتے ہیں؟"

"میٹ بھیا، تم ٹھیک کہتے ہو، بالکل واجب۔ جیل کا ستیاناس ہو، حاکموں کا ستیاناس ہو۔ لیکن، پیارے، میں کیا کروں؟ نہ مجھ سے بیٹھا جاتا ہے، نہ ان پھولوں کی درگت دیکھی جاتی ہے۔ معاف کرو، دوا دو ——— اُف، جاڑا لگ رہا ہے۔"

بیمار قیدی کی آنکھوں میں اب آنسو تھے ——— ایسے آنسو جو دوسروں سے بھی زبردستی آنسو وصول کرتے ہیں! میٹ کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں ——— اس بار تم مرو گے، ماموں! ——— کہہ کے دوا کی پیالی اس کے ہاتھ میں دی۔ ہاتھ کی جنبش سے کچھ دوا اس کی ٹھوڑی پر گر گئی، اور کچھ حلق کے نیچے گئی۔ دوا پی کے اس نے ایک بار تھوکا اور پھر بیٹھا نہیں رہ سکا۔ کمبل اوڑھ، وہیں لڑھک گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر اٹھ بیٹھا۔ ایک بار اس نے سب ہی پیڑ پودوں پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور کھرپی ہاتھ میں لے، اسپتال کی طرف چل پڑا۔ اس بار جاتے وقت میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا ——— ساٹھ سال کی عمر، تانبے سا رنگ، چہرے پر جھریاں، سارے بال سفید، لیکن اس بیماری میں بھی، جب قدم ڈگمگا رہے تھے وہ تن کے جا رہا تھا، جیسے وہ نوجوان ہو۔

میں جس قیدی کی طرف قدرتی طور پر متوجہ ہوا، وہ یہی بچو ماما تھے۔ اس جیل کے تمام قیدیوں کے ماما، وارڈروں کے ماما، جمعداروں کے ماما ——— یوں کہیے،

پورے پٹنہ جیل کے ماما!

اب میں بیجو ماما کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ ان کی بیماری اچھی ہو چکی تھی۔ وہ تمام دن کُھرپی اور کدال سے جھگڑتے رہتے اور انھیں کے سجائے ہوئے باغیچے میں، آم کے درخت کے نیچے بیٹھ کے ان کی محنت و مشقت کو دیکھتا رہتا ——— جب وہ تھک جاتے، میرے پاس آجاتے۔ نہ وہ بیڑی پیتے نہ کھینی (سورتی) کھاتے۔ میں ان کی کیا تواضع کرتا بھلا؟ جیل کی سب سے بڑی خاطر مدارات ان ہی دو نایاب چیزوں سے ہوتی ہے۔ خیر، وہ میرے نزدیک پہنچ کے مجھ سے "سوراج" اور "گاندھی بابا" کے حالات پوچھتے اور میں دھیرے دھیرے ان کی رام کہانی جاننے کی کوشش کرتا۔ دھیرے دھیرے کیونکہ دیکھا، وہ اپنی زندگی کو بند کتاب بنا کر ہی رکھنا چاہتے تھے۔ عام مجرموں کی طرح، اپنی کہانی کو بڑھا چڑھا کے کہنے کی بات تو دور رہی جب بہت کھود کھاد کے بعد کچھ کہتے بھی تو کہتے کہتے شرمیلی لڑکی کی طرح بیچ میں ہی رُک جاتے اور ان کے جُھرّیوں بھرے گالوں کے رنگ میں بھی کچھ تبدیلی آجاتی کبھی کبھی جھلّا کے کہتے ——— یہ پاپ کی کہانی کیا سنتے ہیں آپ؟ چور، بدماس، کی باتیں سُنی جاتی ہیں؟

لیکن ان کی زندگی کی ایک ایک کڑی آخر میں نے جوڑ ہی ڈالی۔

بیجو ماما اسی پٹنہ ضلع کے باڑھ سب ڈویژن کے رہنے والے ہیں۔ ایک معمولی کسان تھے۔ ایک بار حالت ایسی ہو گئی کہ بیل نہیں رہنے کی وجہ سے اُن کی کھیتی رُک گئی۔ کہیں سے تیس روپے قرض لئے اور گنگا پار بیل خریدنے چلے ——— سن رکھا تھا، اس طرف اچھے بیل ملتے ہیں اور سستے بھی۔ گنگا پار

کر کے بیل کے مختلف پیٹھوں (بازاروں) میں گئے۔ کیوں کہ کم سے کم پیسوں میں اچھی سے اچھی چیز چاہتے تھے۔ اسی دوڑ دھوپ میں ان کے دماغ پر شیطان کا قبضہ ہوا۔ انھوں نے دیکھا کہ اس طرف لوگ رات کو گرمیوں میں بیلوں کو گھر سے باہر ہی باندھ دیتے ہیں اور ان کی کوئی خاص رکھوالی بھی نہیں کرتے۔ پٹنہ ضلع میں ایسا نہیں ہوتا۔ شیطان نے آہستہ سے اُن کے کان میں کہا ــــ بجو، کیوں نہ ان میں سے ایک بیل رات کو کھول لو اور گنگا پار کر جاؤ؟ یہ بات انھیں بھا گئی ــــ بیل بھی ہو جائے گا اور پیسے بھی بچ جائیں گے۔ کھیتی بھی ہو جائے گی۔ اور قرض بھی نہیں رہے گا۔ لوگ پوچھیں گے تو کہہ دیا جائے گا، بیل خریدا ہے! بس، ہلدی لگے نہ پھٹکری، رنگ چوکھا آئے ــــ بجو ماما تیار ہو گئے!

ایک رات ایک گاؤں سے، ایک اچھا سا بیل کھول کے وہ چل پڑے۔ گنگا جی کی سمت۔ جس وقت بیل کھولنے گئے تھے، اس وقت تو ہاتھ کانپتے ہی تھے، اب جب دن چڑھ آیا تو ان کا جسم بھی کانپ رہا تھا ــــ جیسے لرزہ آ گیا ہو۔ ٹھیک سے پاؤں نہیں اٹھتے۔ جتنے آدمیوں کو دیکھتے، معلوم ہوتا سب انھیں کی تلاش میں ہیں۔ سب ہی آنکھیں جیسے انھیں کو گھور رہی ہیں۔ ہر انگلی گویا انھیں کی طرف اٹھ رہی ہے۔ ہر سرگوشی میں جیسے انھیں کا ذکر ہو رہا ہے۔ دن ڈھلنے پر وہ ایک دیہاتی سرائے کے نزدیک پہنچے۔ ان کی رگ رگ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ بھوک اور تکان سے پریشان تھے۔ بیل کو ایک درخت سے باندھ، دوکان دار سے لوٹا ڈوری لے، کوئیں پر گئے۔ ہاتھ دھویا۔ ہاتھ منہ دھو ہی رہے تھے کہ دیکھا، ایک دفعدار اُسی دوکان پر آ کے بیٹھ گیا! ــــ

ایں، کیا یہ میری تلاش میں ہے؟ کیوں نہ بیل کو چھوڑ کے بھاگ چلوں؟ تب تو یقینی پکڑا جاؤں گا، کیا مجھ سے بھاگا بھی جائے گا؟ پھر، کیا ایسا بیل زندگی میں میسّر آ سکتا ہے؟ نہیں نہیں، وہ میری تلاش میں نہیں ہے۔

اس طرح سوچ وچار کے بعد وہ دوکان پر آئے۔ دوکان دار سے دو پیسے کے چنے لیے ——— منہ میں رکھتے تھے چنے اور پیٹ میں پھوٹ رہے تھے لاوے۔ چنے مانگتے وقت ان کی مگہی بولی دوکاندار نے سنی تھی، اس لئے جب یہ چنے کھا رہے تھے۔ اُس نے فطری طور پر ان کے گھر وغیرہ کے بارے میں پوچھنا شروع کیا اور گھر کے بعد بیل کا تذکرہ آیا۔ بیچ میں دفعدار پوچھ بیٹھا۔ یہ تمھارا بیل ہے؟ اچھا بیل ہے! کتنے میں خریدا؟ ——— یہ سوال اور بجو ماما کہہ رہے تھے، سنتے ہی ان کے ہوش اُڑ گئے، دو تین سوالات اور، اور وہ دفعدار کود کر انھیں پکڑ چکا تھا ——— چور کہیں کا! یہ بیل چالیس روپے کا ہے؟ اور بازید پور کی بچھیا، کہیں بدھ کو لگتی ہے؟

بیل بھی گیا، ان کے پیسے بھی گئے اور پٹائی بھی کم نہیں ہوئی۔ سمتی پور کے مجسٹریٹ نے ایک سال سزا دی۔ سزا کاٹ کے نکلے تو، پھر کونسا منہ دکھانے گھر جاتے: "بنس، میں کلنک لگایا"

بنس میں کلنک لگایا؟ ——— بجو ماما آپ کون ذات ہیں؟ میں نے متعجب ہو کر ان سے پوچھا۔ کیونکہ ان کا چہرہ بتا تا تھا کہ وہ کسی اچھے گھرانے کے ہیں۔ اس سوال سے وہ گھبرا گئے۔ پھر کہا ——— جیل ٹکٹ میں دیکھئے نہ، دوسادھ لکھا ہے۔

جیل ٹکٹ میں چاہے جو کچھ لکھا ہو، آخر آپ ہیں کون ذات؟ دوسادھ تو آپ
ہو نہیں سکتے!"

میرے بار بار پوچھنے پر بیجو ماما کچھ اداس سے ہو گئے۔ ان کے چہرے
کی جھرّیاں اور گھنی ہو گئیں۔ "چور کا بھی کوئی نام، دھام یا ذات پات ہوتی ہے۔
چور بس چور ہے بابو۔ لیکن حاکم کے سامنے کچھ تو بتانا ہی پڑتا ہے، بس کچھ
لکھا دیا!" ——— اُن کی آواز میں ایک دلی درد تھا۔

"تو کیا آپ کا نام یہ بھی نہیں ہے؟"

تعجب سے جیسے ان کی آنکھیں چمک اٹھی ہوں، فوراً بولے
یہ آپ نے کیسے جانا کہ میرا نام بیجو نہیں ہے؟ بابو آپ ضرور کوئی منتر
جانتے ہیں۔

آخر بیجو ماما نے اپنا نام بھی بتایا اور گاؤں بھی۔ ذات بھی بتائی، گھر کا پورا
حال بھی بتایا۔ تب میں نے پوچھا خیر، یہ تو ہوا، لیکن آپ جنیؤ کیوں نہیں پہنتے
باہمن، چھتری کی یہ نشانی تو نہیں چھوڑنی چاہیئے۔ میرے اس سوال سے
جیسے انھیں دوسری ٹھیس لگی ہو، حسرت ناک لہجے میں بولے۔" اب میں تو
'بھرشٹ' ہو ہی چکا، جنیؤ کو بھی کیوں 'بھرشٹ' کروں، بابو؟ یہی گناہ کیا
کم ہے جو ایک دوسرا بھی کروں!" ان کے اس جواب پر میں نے بتانا چاہا
کہ جیل میں جو چھوت چھات ہوتی ہے، اُس سے ذات نہیں جاتی، جنیؤ آپ
کو ضرور پہننا چاہیئے۔ اس پر انھوں نے کہا ——— میں جیل کی بات نہیں

"تو کیا آپ باہر تاڑی شراب پیتے ہیں؟"

اب تو جیسے ان کا پیمانۂ صبر چھلک گیا ہو۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"ہائے، بابو آپ کتنے بھولے ہیں! کیا بغیر نشہ کھائے چوری ہو سکتی ہے؟ شیطنت کے لئے پہلے شیطان بن جانا پڑتا ہے، بابو!"۔ اور ایک اضطراب کی حالت میں وہ وہاں سے چل دیے۔

مجھے پتہ چل گیا تھا کہ ان کے گھر پہ اب بھی گرہستی ہوتی ہے ——— اچھی گرہستی ہوتی ہے، بھائی مر چکے، دو بھتیجے ہیں، ان کے بال بچے ہیں۔ میں نے بجو ماما کو سمجھایا کہ پرانی باتیں بھول جائیں ——— اس بار چھوٹے تو گنگا اشنان کر کے اپنے گھر پہ چلے جائیے، بھتیجوں سے ساری باتیں کہئے اور ان کے ساتھ رہیے۔ اب ضعیفی کافی ہے، کون جانے کب کیا ہو جائے۔ جیل میں مرئے گا، مٹی بھی خراب ہوگی۔ اس آخری بات نے ان پر کافی اثر کیا! ایک دن دل کھول کر کہنے لگے۔

"کیا کہوں بابو، کئی بار ہی سوچا۔ جیل سے چھوٹنے پر کئی بار گھر کی سمت چلا بھی۔ لیکن بختیار پور تک جاتے جاتے پاؤں بندھ جاتے ہیں! سوچتا ہوں خالی ہاتھ کیسے جاؤں؟ بھتیجے تو مانئے بھی نکلیں گے۔ لیکن بیوہاں تو پرائے گھر کی بیٹیاں ٹھہریں ——— کہیں گی، یہ بڈھا کہاں سے ٹپک پڑا۔ کچھ لے کے جاؤں تو وہ بھی سمجھیں کہ آخر کچھ لایا ہے! کم سے کم ایک گائے ہی خرید کے لے چلوں۔ ایک گائے۔ تیس روپے میں تو اچھی گائے مل جاتی ہے۔ لیکن یہ

روپے کہاں سے آئیں؟ چور ہوں ہی، کیوں نہ ایک آدھ ہاتھ اور بھی مار لوں؟
لیکن، جب جب ایسا کیا، تب تب، روپے پورے ہونے سے پہلے پکڑ لیا
گیا اور پھر یہیں کا یہیں!"

اُف تیس روپے! —— تیس روپے۔ تیس روپے میں بیل اور تیس
روپے میں گائے! اور اُنھیں تیس روپوں کے چکر میں کسی کی زندگی کے تیس سال
برباد ہو گئے! بیچارہ تیس کے عجیب گورکھ دھندے میں پھنس گیا ہے ——
میں اس طرح سوچ ہی رہا تھا کہ بیجو ماما پھر بول اٹھے۔

"ایک بات اور ہے بابو! جب جب باہر جاتا ہوں دن تو اِدھر اُدھر دیکھنے
میں کٹ جاتے ہیں، لیکن جیوں ہی رات کو سونے کی کوشش کرتا ہوں، معلوم
ہوتا ہے، اس جیل کے یہ سارے پیڑ پودے۔ جیسے مجھے پکار رہے ہیں! یہ
آم کا پیڑ، یہ امرود، یہ نیم، یہ جامن —— سب کے سب میرے ہی
لگائے ہوئے ہیں، بابو! میں نے ہی ان کے پودے لگائے، ان کے تھالوں
میں پانی دیا نکونی کی۔ ہوتے ہوتے آج یہ کتنے گھنیرے ہو چلے ہیں! اور
ان بیلوں، گلابوں، گیندوں کا خاندان کس نے لگایا، بڑھایا؟ اسی بیجو
نے بابو! جب باہر ہوتا ہوں، رات کے وقت یہ سب کے سب پکار رہے
رہے ہوتے ہیں! ہاں بابو! سچ کہتا ہوں، نیند نہیں آتی۔ سوچتا ہوں
ہائے آم کی ٹہنی کو کوئی مروڑ نہ دے، اس نیم کو لوگ داتون کر کر کے
سکھا نہ ڈالیں۔ یہ بیلے اور گلاب کے پودے، بغیر سینچائی، کھدائی کے
کہیں برباد نہ ہو جائیں۔ بس کچھ ادھر اُدھر کر کے دوڑا دوڑا پہنچ جاتا ہوں

یہاں۔"

جب بیجو ماما بول رہے تھے، مجھے لگ رہا تھا، میں کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ کیا میں واقعیً جیل میں ہوں؟ میرے پاس بیٹھا، جو یہ سب کچھ کہہ رہا ہے کیا وہ سچ مچ چور ہے؟ کیا چور کا ایسا ہی بھولا بھالا چہرہ ہوتا ہے! کیا اس کی باتیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں؟ اور کیا اس کے ایسے ہی کام ہوتے ہیں؟ جس نے پیڑ پودوں سے اتنا اپنا پا کر لیا ہے جسے پودے پکارتے ہیں، درخت بلاتے ہیں ——— کیا وہ کوئی ادنیٰ درجے کا ذلیل مجرم ہو سکتا ہے؟ اگر یہ مجرم ہے تو لفظ 'جرم' کا معنیٰ ہمیں یقینی بدل ڈالنا ہوگا!

" اور بیجو ماما، اپنی ہولی والی کہانی بھی بابو کو ضرور سُنانا۔" جب ایک دن میٹ نے یہ کہا تو دیکھا، بیجو ماما کے چہرے پر ہنسی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی اور ان کے دانت ——— جو تیس سال سے جیل کی روٹیاں چباتے چباتے آدھے آدھے گھس گئے تھے، لیکن جن میں ٹوٹے ایک بھی نہیں تھے ——— چمک پڑے!" ارے میٹ بھائی، بابو کے سامنے شرمندہ مت کرو۔" اس سے یہ کہہ کے انھوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مجھے ٹالنا چاہا۔ لیکن آخر میں نے ان سے وہ کہانی نکال ہی لی!

ایک بار اتفاق ایسا ہوا کہ بیجو ماما کی رہائی کی تاریخ ٹھیک ہولی کے دن پڑ گئی۔ ٹھیک ہولی کے دن ——— جس دن، سال بھر میں صرف ایک ہی دن، جیل میں پکوان پکتے ہیں! جیل میں پکوان! لیکن آپ متعجب نہ ہوں جہاں بھات میں بھوسی ملی ہوتی ہے اور روٹی میں کنکر، دال میں چھلکے ہوتے ہیں۔ اور

زکاری کے نام پر گھاس کے ڈنٹھلوں کو اُبال دیا جاتا ہے، وہاں کے پکوان بھی کیسے ہوں گے۔ اندازہ لگالیں! لیکن پکوان پھر بھی پکوان ہے۔ گھنے گیہوں کے آٹے میں گُڑ ڈال، سرسوں کے تیل میں تلے پوئے اور تھوڑے سے دودھ میں پورا پانی ڈال کے اُبالی ہوئی کھیر —— یہ پکوان بھی قیدیوں کے منہ میں کم پانی نہیں لے آتے! مہینوں سے اس کا انتظار کیا جاتا ہے! بجو ماما کی زبان بھی اس کے تصور میں کم رال نہیں ٹپکا چکی تھی کہ خبر ملی، اسی ہولی کے دن ان کی رہائی ہونے والی ہے! ہائے رے، یہ کیا غضب ہوا؟

بجو ماما نے جمعدار صاحب سے بڑی لجاجت کے ساتھ آرزو منت کی کہ کسی طرح وہ جیلر بابو سے کہہ سُن کے ان کی رہائی کی تاریخ ایک دن اور بڑھوا دیں. لیکن جمعدار صاحب نے پہلے سمجھا کے، پھر ڈانٹ کے کہہ دیا کہ ایسا ہو نہیں سکتا. خیر رہائی کا دن پہنچا، وہ گیٹ پر لائے گئے تو انھوں نے دیکھا، پوئے پکانے کے لئے تیل اور گڑ ۵ اندر بھیجے جا رہے ہیں۔ پکوان کے ان سامانوں کو دیکھ کے ان کی آنکھیں چھلک آئیں. جیلر صاحب کا دھیان بجو ماما کی طرف گیا۔ بھلا انھیں کون نہیں پہچانتا؟ جیلر صاحب نے سمجھا، شاید یہ آنسو خوشی یا ندامت کے ہیں۔ کہہ بیٹھے "کیوں بجو پھر تو نہیں آؤ گے؟" ان کا یہ کہنا تھا کہ بجو ماما کی آنکھوں میں ساون بھادوں اُمنڈ آئے اور رندھے ہوئے گلے سے بولے۔

"بابو میری تقدیر پھوٹ گئی بابو!"

جیلر صاحب، شریف مسلمان جیلر صاحب، یہ سُن کے گھبرا گئے۔ یہ کیا ہوا؟ پوچھا —— کیا ہوا ہے، بتاؤ بجو!" کوئی غمی کی خبر آئی ہے کیا ——

وہ دِل ہی دل میں سوچنے لگے۔ بیجو ماما بولے۔" حضور، اس میں آپ کا کیا ہاتھ! میری ہی تقدیر پھوٹ گئی بابو!"

"ارے کیا ہوا بیجو؟"——— جیلر صاحب کی تشویش میں اب رحم کا جذبہ بھی شامل تھا۔ ادھر بیجو ماما کی آنکھوں کی گھٹا میں جھڑی لگ رہی تھی۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولے۔

"ہائے سرکار، جب تیل اور گڑ ۱۵ اندر جا رہے ہیں تو میں باہر بھیجا جا رہا ہوں۔ بھرے برت کے دن نکالا جا رہا ...." وہ آگے نہ بول سکے۔ اِدھر جیلر صاحب قہقہہ لگا کے ہنس پڑے اور جیب سے ایک روپیہ نکال کے، بیجو ماما کو دیتے ہوئے بولے کہ جاؤ، بازار میں اسی کے پوئے خرید کے کھا لینا۔ لیکن چاندی اس چمکیلے ٹکڑے کا ان کے دل میں ذرا بھی موہ کیوں ہونے لگا؟ روپیہ جیلر صاحب کے پاؤں پر رکھ دیا اور جیل میں ایک دن کے لئے اور بھی رکھ لیے جانے کی التجا کرنے لگے۔ جیلر صاحب نے اس سلسلے میں اپنی لاچاری دکھائی۔ بار بار کے اصرار پر بھی روپیہ نہیں لے کے، دھوتی کے کنارے سے آنسو پونچھتے ہوئے، بیجو ماما باہر چلے آئے۔

باہر چاروں طرف ہولی کا ہڑ بونگ مچا تھا۔ رنگ، عبیر اُڑ رہے تھے، گانے بجانے ہو رہے تھے۔ جیل سے جو تین آنے پیسے ملے تھے، اس کا ستو خرید کے بیجو ماما نے کھایا اور دن بھر اِدھر اُدھر بے دلی سے تماشے دیکھتے رہے۔ شام کو اسٹیشن کے مال گودام کے سامنے جا کر لیٹ رہے اور کچھ

اندھیرا ہونے پر ایک بیل گاڑی کے پاس بندھے جوڑے بیل کو کھول کے لے چلے۔ گاڑی بان دن بھر کی دھوم دھام کے بعد کچھ ایسا مست ہو کے سویا تھا کہ اسے کچھ سدھ نہیں رہ گئی تھی! اب بجو ماما کیا کریں؟ وہ خود ہی چلّا چلّا کے کہنے لگے ——— "او گاڑی بان، او گاڑی بان، کیسا بے وقوف سا سو رہا ہے۔ اور چور تیرے بیل لئے جا رہے ہیں۔" لفظ بیل کان میں پڑتے ہی گاڑی بان چونک اٹھا اور جس طرف سے آواز آئی تھی اُدھر دوڑا۔ اسے دوڑتے دیکھ بجو ماما نے بھاگنے کا بہانہ کیا۔ پکڑے گئے، کچھ گھونسے کھائے، رات بھر حوالات میں اور صبح ہی پھر جیل میں حاضر!

سارے جیل میں ہلّا ہو گیا ——— بجو ماما آ گئے، آ گئے! لیکن بجو ماما تو آتے ہی میٹ سے ملے اور کہا ——— "کہاں رکھے ہیں پوئے، لانا تو میٹ بھائی!" میٹ ہنس رہا تھا۔ بجو ماما اس سے کہہ گئے تھے کہ دو ایک پوئے میرے لئے ضرور چرا کے رکھ دینا۔ کل میں ضرور آ جاؤں گا! بجو ماما اپنے ضرور، کو ضرور ہی پورا کریں گے، اس کی امید بھی میٹ کو نہیں تھی۔ جیوں ہی میٹ نے کہا ——— "پوئے کہاں رکھے ہیں؟" بجو ماما کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے! "اُف، اسی پوئے کے واسطے رات اس گاڑی بان کے کتنے گھونسے میں نے برداشت کئے! رات بھر حوالات میں پوؤں کے ہی خواب دیکھتا رہا ہوں، میٹ بھائی۔ مگر ہائے رے تقدیر!" اب میٹ کی آنکھیں بھی چھلک آئی تھیں۔ اس نے اپنے لئے جو پوئے بچا چھپا کے رکھ چھوڑے تھے، انھیں لا کر بجو ماما کے سامنے رکھ دیا ——— بجو ماما

ان باسی، کاٹھ کی طرح سوکھے۔ تیل کے پوؤں کو کُتر کُتر کے کھا رہے تھے۔ جوان کی آنکھوں کے پانی سے نرم اور نمکین بنتے جاتے تھے۔

اس بار وہ کیسے جیل میں آئے ہیں، یہ واقعہ بھی کچھ کم دلچسپ اور حسرتناک نہیں ہے۔

اس بار بھجو ماما یہ فیصلہ کر کے جیل سے نکلے تھے کہ تیس روپے کسی نہ کسی طرح ضرور جمع کریں گے۔ اور انھیں روپیوں سے ایک گائے خرید کے، اپنے بھتیجوں کے پاس جائیں گے۔ گائے کی ڈور پکڑے جب وہ تقریباً تیس سال بعد اپنے گاؤں میں پہنچیں گے، تو گاؤں کیسا نظر آئے گا۔ لوگ انھیں پہچان بھی سکیں گے یا نہیں، وہ کس طرح اپنا تعارف کرائیں گے —— وغیرہ کے تصور میں مگن ہی انھوں نے جیل سے باہر قدم رکھا تھا۔

شروع میں معلوم ہوا، اس بار تقدیر یاوری کر رہی ہے۔ بڑی چوری میں بڑا خطرہ ہے! اور خطرہ لینے کا اس بار موقع نہیں تھا۔ اس لئے چھوٹی چھوٹی چوریاں تیس روپیوں کے لئے شروع کیں۔ ایک ہوٹل سے دو لوٹے اڑائے، دو روپے میں بیچ دئے۔ ایک مندر کے احاطے سے دو کمبل مار لئے۔ تین روپے ان سے آئے۔ ایک وکیل صاحب کے برآمدے سے ایک شال اڑا لائے۔ چار روپے اور آئے۔ سب سے بڑا شکار، ایک گودام سے ایک بوری لال مرچ کا کیا، جس سے انھیں نقد بارہ روپے ملے۔ اب بھجو ماما کے پاس اکیس روپے تھے۔ صرف نو روپیوں کی کمی تھی۔ مرچوں کی چوری سب سے اچھی۔

ایک دن جب وہ شہر سے باہر رفع حاجت کی غرض سے جا رہے تھے۔ انھوں نے کھیتوں میں لال مرچیں لگی دیکھیں۔ کون جانے شہر کی چوریلوں میں کس دن پکڑا جاؤں، کیوں نہ رات کو مرچ کے کھیتوں میں پہنچوں اور تھوڑی تھوڑی مرچیں توڑ توڑ کے بیچتا جاؤں؟ یہی دس پندرہ دن لگیں گے، لیکن خطروں سے تو محفوظ ہوں گا نہ؟ ——— ایسا سوچ کے اب وہ ہر رات مرچوں کے کھیتوں میں جاتے اور ایک جھولا مرچیں لے آتے، پھر بازار میں کسان کی طرح بیچ لیتے۔ رفتہ رفتہ ان کے پاس چھبیس روپے ہو گئے۔ صرف چار رپیوں کی کمی ——— ہاں صرف چار رپیوں کی ——— !

منزل سے قریب ہو کے راہرو کے قدم ذرا تیزی سے اٹھنے لگتے ہیں۔ اس کی رفتار میں تیزی آنے لگتی ہے۔ ایک دن بجو ماما اتنی مرچیں توڑ لائے کہ سوا روپیہ مل گیا۔ اب پونے تین روپوں کی کمی رہ گئی تھی۔

تین ——— ہائے! تین کتنا بڑا عدد ہے۔ اس رات ماما جب کھیت میں پہنچے، انھیں گھیر لیا گیا۔ بیچارے کسان کچھ دنوں سے پریشان تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ان کی کھیتی اجڑ رہی ہے۔ کئی دنوں سے وہ تاک لگائے ہوئے تھے کہ آج انھوں نے چور کو دیکھ لیا اور دوڑ پڑے۔ ماما بھاگیں تو کدھر؟ انھیں ایک ترکیب سوجھی۔ جتنی مرچیں توڑی تھیں، فوراً سب کو آس پاس میں پھینک دیا اور اس طرح بیٹھ گئے گویا رفع حاجت کر رہے ہوں۔ لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور یہ ہیں کہ بولتے تک نہیں۔ ایک نے کہا۔ اٹھتے ہو یا لگاؤں ایک لاٹھی؟

ماما کھڑے ہو گئے ——— دھوتی اس طرح کئے جیسے ضرورت سے فارغ ہو کر اٹھے ہوں! وہ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ شاید میں بچ گیا، کہ ٹھیک اسی وقت کھیت کے بغل سے جانے والی سڑک پر ایک موٹر گزری اور اس کی تیز روشنی میں ان کے آس پاس بکھری مرچیں دکھائی پڑ گئیں۔ اور بابو، ڈر کے مارے پیشاب بھی تو نہیں ہو پایا تھا! ——— مجھ سے ماما نے ہنستے ہوئے کہا۔ اب کیا تھا، چوری صاف صاف پکڑ لی گئی تھی۔ ماما پھر تھانے میں حاضر کئے گئے۔ پھر وہی حوالات ——— پھر وہی بارہ کا چھوٹا جیل خانہ، پھر وہی مجسٹریٹ کی عدالت۔

لیکن اس دفعہ خاص بات یہ ہوئی کہ کسی طرح پولیس نے یہ پتا لگا لیا کہ ماما پرانے مجرم ہیں ——— نتیجہ یہ ہوا کہ اُن پر سشن کیس چلانے کی تیاریاں کیں۔ نوجوان مجسٹریٹ نے پولیس کی بات مان لی! داروغہ نے گالیاں دیتے ہوئے کہا ——— "بڈھے اس بار پانچ سال کے لئے تمھیں چکی پیسنی پڑے گی۔"

سشن جج ایک بوڑھا آدمی تھا۔ جب اس نے ماما سے قصور کے بارے میں پوچھا تو ماما انکار نہیں کر سکے۔ جھوٹ کیسے بولتے؟ ہاں، ایک عرض کی۔

"حضور، سنتے ہیں، سرکار پچیس سال کام کرنے پر اپنے ملازموں کو پنشن دیتی ہے۔ حضور بھی بوڑھے ہوئے۔ اب پنشن پائیں گے۔ میں نے تیس سال تک جیل میں رہ کے سرکار کا کام کیا ہے! دہائی سرکار، دھرم کی، ساکھی، ہے،

کام کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ جیلر صاحب کو بلا کے پوچھیئے، جمعدار صاحب کو بلا کے پوچھیے۔ بیجو بغیر کام کئے روٹی کھا نہیں سکتا، سرکار! اب تیس سال کی اس گاڑھی محنت کے بعد کیا حضور، اس بڈھے کو بھی پنشن کا حق نہیں ہے؟ دہائی حضور کی، دہائی ماں باپ کی، آپ 'انصاپھ' کیجیے ——— حضور سے اُنصاپھ، نہ ملا تو یہ بڈھا اور کہاں جائے گا؟"

یہ عجیب دلیل تھی! لیکن دِل پر اس کا اثر بھلے ہی ہو۔ دماغ پر یہ کیا اثر ڈال سکتا تھا بھلا؟ اور جج تو بندھا ہے قانون کی کتاب سے۔ اُس قانون کی کتاب میں سزا کے لیے جو ضروری لوازمات چاہیئے، سب موجود تھے! جُرم، گواہیاں ——— اقبال جرم! وہ کتاب جج کو یہ حق کہاں دیتی ہے کہ وہ دیکھے کہ جرم کیوں کیا گیا، اس میں سماج کہاں تک مجرم ہے اور آدمی کہاں تک، افراد کے افعال میں ماحول کا کہاں تک ہاتھ ہے وغیرہ وغیرہ! پھر آدمی کے اندر جو انسانیت ہے اُسے اُبھرنے دینے، اور مجرم کو صحیح راستے پر چلنے میں مدد دینے کی طرف دھیان دینا، تو اس کتاب میں گویا حرام ہے۔ جج بے چارے بوڑھے تھے، رحم دل تھے، لیکن جو کتاب انھیں روٹی دے رہی تھی، اس ضعیفی کو آرام سے گزارنے میں مدد پہنچا رہی تھی، اس کی خلاف ورزی کیسے کرتے بے چارے؟ ہاں انھوں نے شاید کبھی شیکسپیر کی 'مرچنٹ آف وینس' پڑھ لی تھی۔ اس لئے اپنے فیصلے پر اس بار رحم کا ملمع چڑھانے سے وُہ رُک نہیں سکے۔ اس بار بیجو ماما کو صرف ایک سال کی سزا ملی۔

سُبحان خاں

"کیا آپ کا اللہ پچھم میں رہتا ہے؟ وہ پورب میں کیوں نہیں رہتا؟"

سبحان دادا کی لمبی، سفید، چمکیلی اور رعب دار ڈاڑھی میں اپنی انگلیاں ڈالتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ان کی کشادہ، اُبھری پیشانی پر خوشی کی ایک جھلک اور ڈاڑھی مونچھوں سے چھپے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اپنے لمبے ہاتھوں کی داہنی ہتھیلی میرے سر پر پھیرتے ہوئے، انھوں نے کہا۔

"نہیں بُوا، اللہ تو پورب، پچھم، اتر، دکھن سب طرف ہے!"

"تو پھر آپ پچھم منہ کھڑے ہو کر ہی نماز کیوں پڑھتے ہیں؟"

"پچھم سمت کے ملک میں اللہ کے رسول آئے تھے۔ جہاں رسول آئے تھے وہاں ہماری تیرتھ ہیں۔ ہم انھیں مقدس تیرتھوں کی طرف منہ کر کے اللہ

کی یاد کرتے ہیں۔"

"وہ تیرتھ یہاں سے کتنی دور ہوں گی؟"

"بہت دور!"

"جہاں سورج دیوتا ڈوبتے ہیں؟"

"نہیں اس سے کچھ اِدھر ہی!"

"آپ اُن تیرتھوں میں گئے ہیں، سبحان دادا؟"

دیکھا، سبحان دادا کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اُن کا چہرہ سُرخ ہو اٹھا۔ جذبات سے مغلوب ہوکر، وہ مغموم لہجے میں بولے۔

"وہاں جانے میں بہت خرچ پڑتے ہیں، بُبُوا! میں غریب آدمی ٹھہرا نہ؟ اس بڑھاپے میں بھی اتنی محنت مشقت کر رہا ہوں کہ کسی طرح کچھ پیسے بچا پاؤں اور اس پاک مقام کی زیارت کر آؤں!"

ان کی آنکھیں دیکھ کے میرا بچپن کا دل بھی جذبات سے بھر آیا۔ میں نے اُن سے کہا۔

"میرے ماما جی سے کچھ قرض کیوں نہیں لے لیتے دادا؟"

"قرض کے پیسوں سے حج کرنے میں ثواب نہیں ملتا، بُبُوا۔ اللہ نے چاہا تو ایک دو سال میں اتنے پیسے جمع ہو جائیں گے کہ کسی طرح وہاں جا سکوں۔"

"وہاں سے میرے لئے بھی کچھ سوغات لائیے گا نہ؟ کیا لائیے گا؟"

"وہاں سے لوگ کھجور اور چھوارے لاتے ہیں۔"

"ہاں ہاں میرے واسطے چھوارے ہی لائیے گا ——— لیکن ایک درجن سے کم نہیں لوں گا، ہوں!"

سبحان دادا کی سفید ڈاڑھی اور مونچھوں کے درمیان ان کے سفید دانت چمک رہے تھے۔ کچھ دیر تک مجھے پیار کرتے رہے۔ پھر کچھ رک کر بولے ———

"اچھا جائیے، کھیلئے۔ میں ذرا کام پورا کر لوں۔ مزدوری بھر پورا کام نہیں کرنے سے اللہ ناراض ہو جائے گا۔"

کیا آپ کے اللہ بہت غصّہ ور ہیں؟" میں تنک کر بولا۔

اب سبحان دادا زور سے ہنس پڑے، پھر ایک بار میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"بچوں سے وہ بہت خوش رہتا ہے، ببُوا! وہ تمھاری عمر دراز کرے۔"

کہہ کے مجھے اپنے کندھے پر لے لیا۔ مجھے لئے ہوئے دیوار کے نزدیک آئے، وہاں اتار دیا اور فوراً اپنی کرنی اور لسولی سے دیوار پر کام کرنے لگے۔

سبحان خاں ایک ہوشیار معمار سمجھے جاتے ہیں جب جب مکان کی دیواروں کی مرمّت کی ضرورت ہوتی ہے، انھیں بلا لیا جاتا ہے۔ آتے ہیں، پانچ سات دن، یہیں رہتے ہیں، کام ختم کر کے چلے جاتے ہیں۔

لمبا، چوڑا، تنگڑا ہے جسم ان کا۔ پیشانی چوڑی، بھویں گھنی اور ابھری۔ آنکھوں کے کونوں میں کچھ سُرخی اور پتلیوں میں کچھ نیلے پن کی جھلک۔ ناک غیر معمولی طور پر نکیلی، ڈاڑھی گھنی، اتنی لمبی کہ سینے تک پہنچ جائے ——— وہ سینہ جو بڑھاپے میں بھی پھیلا اور بھرا ہوا ہے۔ سر پہ ہمیشہ ایک دو پلّی ٹوپی رکھے

ہوتے اور بدن میں نیم آستین۔ کمر میں کچھے والی دھوتی، پاؤں میں چمار و جوتا، چہرے سے نور برستا، منہ سے شہد رستا، بولنے، چلنے، بیٹھنے، اُٹھنے کے شریفانہ قاعدوں کی پوری پابندی کرتے۔

لیکن بچپن میں مجھے سب سے زیادہ بھاتی ان کی وہ سفید چمکتی ہوئی ڈاڑھی۔ نماز کے وقت کمر میں دھاری دار لنگی اور بدن پر سادہ کرتا پہن، دونوں ہاتھ سینے سے نیچے باندھ، آنکھیں آدھی بند کر کے جب وہ کچھ 'منتر' پڑھنے لگتے تو میں دم بخود انھیں دیکھتا رہ جاتا! مجھے ایسا معلوم ہوتا، جیسے واقعی ان کے اللہ وہاں آگئے ہیں، دادا کی نیم باز آنکھیں انھیں دیکھ رہی ہیں اور یہ ہونٹوں میں ان سے باتیں کر رہے ہیں۔

ایک دن طفلانہ اشتیاق میں مَیں نے اُن سے پوچھ بھی ڈالا ——

"سبحان دادا، آپ نے کبھی اللہ کو دیکھا ہے؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہو ببُوا؟ انسان ان آنکھوں سے اللہ کو نہیں دیکھ سکتا!"

"مجھے دھوکا مت دیجئے دادا! میں سب دیکھتا ہوں۔ آپ روز انھیں آدھی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، ان سے بُدبُدا کے باتیں کرتے ہیں۔ ہاں ہاں مجھے چکمہ دیتے ہیں آپ!"

"میں اور اس سے گفتگو! میری ایسی تقدیر کہاں؟ اس سے صرف رسولؐ کی باتیں ہوتی تھیں، ببُوا! وہی باتیں قرآن شریف میں لکھی ہیں!"

"اچھا دادا، کیا آپ کے رسول صاحب کے بھی ڈاڑھی تھی!"

"ہاں ہاں، تھی —— بڑی خوب صورت، لمبی، سنہری ——

اب بھی ان کی ڈاڑھی کے کچھ بال بکتے ہیں رکھے ہیں۔ ہم تیرتھ کے موقع پر ان بالوں کے بھی درشن کرتے ہیں۔"

"بڑے ہونے پر جب میرے ڈاڑھی نکلے گی تو میں بھی ڈاڑھی رکھوں گا دادا! خوب لمبی ڈاڑھی۔

سبحان خاں نے مجھے گود میں اٹھالیا، پھر کندھے پر چڑھا کے اِدھر اُدھر گھمایا۔ طرح طرح کی باتیں سُنائیں، کہانیاں کہیں۔ میرا دِل بہلا کے وہ پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ معلوم ہوتا تھا، کام اور اللہ، یہی دو چیزیں دنیا میں ان کے لئے سب سے پیاری تھیں۔ کام کرتے ہوئے اللہ کو نہیں بھولتے تھے اور اللہ سے فرصت پا کے پھر فوراً کام میں جٹ یا جُت جانا اپنا مقدس فرض سمجھتے تھے۔ اور ——— اللہ اور کام کا یہ میل ان کے دل میں محبت کے وہ کوثر و تسنیم بہاتا جن میں مجھ جیسے بچے بھی بڑے مزے میں ڈبکیاں لگا سکتے تھے۔

نانی نے کہا ——— سویرے نہا کھا لو، آج تمھیں امام حسینؑ کے پیک میں جانا ہوگا! سبحان خاں آتے ہی ہوں گے!

جن دیوتاؤں اور بزرگوں کی کتنی منتوں کے بعد ماں نے مجھے حاصل کیا تھا ان میں ایک حضرت امام حسینؑ بھی تھے۔ نو سال کی عمر تک، جب تک جنیو نہیں ہو گئی، محرم کے دنوں میں، مسلمان بچوں کی طرح، مجھے بھی تعزیئے کی چاروں طرف رنگین چھڑی لے کر طواف کرنا پڑا ہے اور گلے میں گنڈے، بدھیاں لٹکا پہننی پڑی ہیں۔ محرم، ان دنوں میرے لئے، بے حد خوشی کے دن تھے۔ نئے کپڑے پہننا۔

اچھلتا کودتا، نئے نئے چہرے اور طرح طرح کے کھیل دیکھتا ——— دھوم دھام میں چار پہر فوراً ہی بیت جاتے! اس محرم کے پیچھے جو المناک، دل دوز اور حزن و ملال سے بھرا درد انگیز واقعہ چھپا ہے، ان دنوں اس کی خبر بھی کہاں تھی!

خیر میں نہا دھو، پہن اوڑھ کے انتظار ہی کر رہا تھا کہ سبحان دادا پہنچ گئے۔ مجھے کندھے پر لے لیا اور اپنے گاؤں میں لے گئے۔

ان کا گھر کیا تھا۔ بچوں کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ پوتے پوتیوں، ناتی نातنوں کی بھرمار تھی ان کے گھر میں۔ میری ہی عمر کے بہت سے بچے! رنگین کپڑوں سے سجے دھجے ——— سب گویا میرے ہی منتظر تھے۔ جب میں پہنچا، سبحان دادا کی بوڑھی بیوی نے میرے گلے میں ایک بدھی ڈال دی، کمر میں گھنٹی باندھ دی، ہاتھ میں دو لال چھڑیاں دے دیں اور ان بچوں کے ساتھ مجھے لئے ہوئے کربلا کی طرف چلیں۔ دن بھر اچھلا کودا، تماشے دیکھے، مٹھائیاں اڑائیں اور شام کو پھر سبحان دادا کے کندھے پر گھر پہنچ گیا۔

عید، بقر عید میں نہ سبحان دادا ہمیں بھول سکتے تھے، نہ ہولی، دیوالی میں ہم انھیں! ہولی کے دن نانی اپنے ہاتھوں سے پوئے، کھیر اور مٹھائی نکال کے سبحان دادا کو کھلاتیں۔ اور تب میں ہی اپنے ہاتھوں سے عبیر لے کر ان کی ڈاڑھی میں ملتا۔ ایک بار جب ان کی ڈاڑھی رنگین ہو چکی تھی، مجھے ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ میں نے کہا۔

"سبحان دادا، رسولؐ کی ڈاڑھی بھی تو ایسی ہی رنگین رہی ہو گی؟"

"ان پر اللہ نے ہی رنگ دے رکھا تھا، ببوا۔ اللہ کی ان پر خاص

مہربانی تھی۔ ان کا سا نصیبہ ہم معمولی انسانوں کا کہاں؟" وہ آنکھیں بند کر کے کچھ بڑبڑانے لگے ——— جیسے وہ دھیان میں انھیں دیکھ رہے ہوں

میں بھی کچھ بڑا ہوا، ادھر دادا بھی آخر حج کر ہی آئے۔ اب میں بڑا ہو چکا تھا، لیکن وہ چھواروں کی بات بھولے نہیں تھے۔ جب میں چھٹیوں میں شہر کے اسکول سے لوٹا اور دادا یہ متبرک سوغات لے کے پہنچے۔ ادھر ان کے گھر کی حالت بھی اچھی ہو چلی تھی۔ دادا کی ایمانداری اور لائق بیٹوں کی محنت نے کافی پیسے اکٹھے کر لئے تھے۔ لیکن ان میں وہی انکساری اور انسانیت تھی۔ آئے، اور پہلے کی طرح ہی اخلاق برتا۔ پھر چھوارے نکال میرے ہاتھوں میں رکھ دئے "بوا، یہ آپ کے لئے خاص عرب سے لایا ہوں۔ یاد ہے نہ، آپ نے ان کی فرمائش کی تھی؟ ان کے نتھنے انتہائی مسرت سے پھڑک رہے تھے۔

چھوارے لئے، سر چڑھایا۔ خواہش ہوئی، کاش آج پھر بچہ ہو جاتا۔ اور ان کے کندھوں سے لپٹ کے ان کی سفید ڈاڑھی میں، جو اب واقعی نورانی ہو چکی تھی، انگلیاں ڈال کے، انھیں دادا، دادا کہہ کے پکار اٹھتا! لیکن نہ میں اب بچہ ہو سکتا تھا، نہ زبان میں وہ معصومیت اور پاکیزگی رہ گئی تھی! انگریزی اسکول کے ماحول نے کچھ عجیب غیر فطری انداز ہر بات میں پیدا کر دیا تھا۔ لیکن، ہاں شاید ایک چیز اب بھی پاکیزہ رہ گئی تھی۔ آنکھوں نے اپنے کو آنسوؤں کی روانی سے پاک کر کے، انھیں چپ چاپ دادا کے قدموں پر نذرانہ چڑھا دیا!

حج سے واپس آنے کے بعد سبحان دادا کا زیادہ وقت نماز وظیفے میں گزرتا۔ دن بھر ان کے ہاتھوں میں تسبیح کے دانے گھومتے تو اُن کی زبان اللہ اللہ کے رٹ لگائے رہتی جوار بھر میں ان کی بزرگی کی دھاک تھی۔ بڑے بڑے جھگڑوں کی پنچایتوں میں دُور دُور کے ہندو مسلمان انھیں پنچ مقرر کرتے۔ اُن کی ایمانداری اور دیانت داری کی کچھ ایسی دھوم تھی۔

سبحان دادا کا ایک ارمان، تھا، مسجد بنانے کا، میرے ماما کا مندر انھیں نے بنایا تھا۔ اُن دنوں وہ معمولی معمار تھے۔ لیکن کہا کرتے۔ اللہ نے چاہا تو میں بھی ایک مسجد ضرور بنواؤں گا۔

اللہ نے چاہا اور وہ دن بھی آیا۔ اُن کی مسجد بھی تیار ہوئی۔ گاؤں کے ہی مناسبت سے ایک چھوٹی سی مسجد —— لیکن بڑی ہی خوب صورت۔ دادا نے اپنی زندگی بھر کا جمع کیا ہوا ہنر اس میں خرچ کر دیا تھا۔ ہاتھوں میں اتنی طاقت نہیں رہ گئی تھی کہ اب خود کرنی بسولی پکڑتے، لیکن دن بھر بیٹھے بیٹھے ایک ایک اینٹ کی جُڑائی پر دھیان رکھتے اور اندرونی حصے میں جو بیل بوٹے کاڑھے گئے تھے، ان کے سارے نقشے انھوں نے ہی تیار کئے تھے۔ ان میں سے ایک ایک پچی کاری ان کی ہی باریک بیں نگرانی میں ہوئی تھی۔

میرے ماما جی کے باغ میں شیشم، ساکھو، کٹھل وغیرہ عمارتوں میں کام آنے والے بہتیرے درخت تھے۔ مسجد کے لئے تمام لکڑیاں ہمارے ہی باغ سے لی گئی تھیں۔

جس دن مسجد تیار ہوئی تھی۔ سبحان دادا نے جوار بھر کے معزز لوگوں کو

دعوت دی تھی۔ جمعہ کا دن تھا۔ جتنے مسلمان تھے، سبھوں نے اس میں نماز پڑھی تھی۔ جتنے ہندو آئے تھے، ان کی تواضع کے لئے دادا نے حلوائی رکھ کے طرح طرح کی مٹھائیاں بنوائی تھیں، پان، الائچی کا انتظام کیا تھا۔ اب تک اس مسجد کی افتتاح کے دن کی، دادا کی مہمان نوازی کو لوگ بھولے نہیں ہیں۔

زمانہ بدلا۔ میں اب زیادہ تر شہروں میں ہی رہتا۔ اور شہر اب آئے دن ہندو مسلم فسادوں کے اکھاڑے بن چکے تھے۔ ہاں آئے دن! دیکھئے گا، ایک ہی سڑک پر ہندو مسلمان چل رہے ہیں، ایک ہی دوکان پر سودے خرید رہے ہیں، ایک ہی سواری پر پہلو بہ پہلو بیٹھے آجا رہے ہیں، ایک ہی اسکول میں پڑھ رہے ہیں، ایک ہی دفتر میں کام کر رہے ہیں کہ اچانک سب کے سروں پر شیطان سوار ہو گیا۔ ہنگامہ، بھگدڑ، مار پیٹ، خون خرابہ، آتش زدگی ———— ہر طرح کے خرافات کی آزادی! نہ گھر محفوظ، نہ جان نہ عزت۔ محبت، بھائی چارہ اور رحم دلی کی جگہ پر نفرت، مخاصمت اور قتل و غارتگری کا ننگا ناچ!

شہروں کی یہ بیماری رفتہ رفتہ دیہاتوں میں داخل ہونے لگی۔ گائے اور باجے کے نام پر تکراریں ہونے لگیں۔ جو زندگی بھر قصاب خانوں کے لئے اپنی گائیں بیچتے رہے، وہی ایک دن کسی ایک گائے کے ذبح ہونے کا نام سن کر کتنے انسانوں کے گلے کاٹنے کو تیار ہونے لگے۔ جن کے شادی بیاہ، پرب، تہوار بغیر باجوں کے نہیں ہوتے، جو محرم جیسے ماتم کے دن بھی باجے گاجے کی دھوم کئے رہتے۔ اب وہی اپنی مسجدوں کے سامنے سے گزرتے

ہوئے ایک منٹ کے بجائے، خون کی ندیاں بہانے کو تیار ہو جاتے۔

کچھ پنڈتوں کی بن آئی، کچھ ملاؤں کی دال گلی۔ سنگٹھن اور تنظیم کے ناموں پر پھوٹ اور جھگڑوں کے بیج بوئے جانے لگے۔ لاٹھیاں اچھلیں، چھرے نکلے، کھوپڑیاں پھوٹیں، انتڑیاں باہر نکلیں، کتنے نوجوان مرے، گھر پھنکے۔ باقی بچ گئے کھیت کھلیان، سو انگریزی عدالت کے اخراجات میں بعد کو قرق ہوئے!

خبر پھیلی، اس سال سبحان دادا کے گاؤں کے مسلمان بھی گائے کی قربانی کریں گے۔ جوار میں مسلمان کم تھے لیکن ان کے جوش و خروش کا کیا کہنا! ادھر ہندوؤں کو جتنی گائے سے محبت نہ تھی۔ اس سے زیادہ اپنی تعداد پر گھمنڈ تھا۔ تناتنی کا بازار گرم! خبر یہ بھی پھیلی کہ سبحان دادا کی مسجد میں ہی قربانی ہوگی۔

"ایں، سبحان دادا کی مسجد میں قربانی؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا!"

"اگر ہوئی تو کیا ہوگا؟ ہماری ناک کٹ جائے گی! لوگ کیا کہیں گے۔ اتنے ہندوؤں کے رہتے گؤ ماتا کے گلے پر چھری چلی؟"

"چھری سے گؤ ماتا کو بچانا ہے، تو گورا گوری کے قصاب خانے پر ہم دھاوا بولیں اور اگر سچ مچ جوش ہے، تو چلئے مظفر پور! انگریزی فوج کی چھاؤنی پر ہی دھاوا بولیں۔ قصاب خانوں میں تو بوڑھی گائیں کٹتی ہیں، چھاؤنی میں موٹی تازی بچھیاں کاٹی جاتی ہیں!"

"لیکن وہ تو ہماری آنکھوں سے دور ہیں۔ دیکھتے ہوئے مکھی کیسے نگلی جائے گی؟"

"معاف کیجئے، دور نزدیک کی بات نہیں ہے۔ بات ہے ہمّت کی، طاقت کی۔ چھاؤنی میں آپ نہیں جاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں سیدھے توپ کے منہ میں جانا ہوگا۔

یہاں مسلمان مٹھی بھر ہیں، اس لئے آپ ان پر ٹوٹنے کو اُتاؤلے ہیں۔"

"آپ سبحان خاں کی طرف داری کر رہے ہیں، دوستی نبھاتے ہیں! دھرم سے بڑھ کے دوستی نہیں!"

چند نوجوانوں کو میرے ماما جی کی باتیں ایسی بُری لگیں کہ وہ سخت و سُست کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ کے چل دئے۔ لیکن کتنا ہی غصہ کیوں نہ کیا جائے، کتنی ہی چیخ پکار کیوں نہ کی جائے ——— یہ بات صاف تھی کہ بغیر ماما کی رضامندی کے کسی بڑے واقعے کے لئے کسی کو قدم اٹھانے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔

اُدھر سبحان دادا کے دروازے پر بھی مسلمانوں کی بھیڑ ہے۔ نہ جانے دادا میں کہاں کا جوش آگیا ہے، وہ کڑک کر کہہ رہے ہیں۔

"گائے کی قربانی نہیں ہو گی! یہ فضول باتیں سننے کو میں تیار نہیں ہوں، تم لوگ ہماری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاؤ!"

"کیوں نہیں ہو گی؟ کیا ہم اپنا مذہب ڈر سے چھوڑ دیں؟"

"میں کہتا ہوں یہ مذہب نہیں ہے میں حج کر کے آیا ہوں، قرآن میں نے پڑھا ہے گائے کی قربانی لازمی نہیں ہے۔ عرب میں لوگ عموماً دُنبے اور اونٹ کی قربانی کرتے ہیں۔"

"لیکن اگر ہم گائے کی ہی قربانی کریں تو وہ روکنے والے کون ہوتے ہیں؟.... ہمارے مذہب میں وہ دست اندازی کیوں کریں گے؟"

"ان کی بات ان سے پوچھو۔ میں مسلمان ہوں، کبھی اللہ کو بھولا نہیں ہوں میں میں مسلمان کی حیثیت سے کہتا ہوں، میں گائے کی قربانی نہیں ہونے دوں گا!"

دادا کی بڑی ڈاڑھی ہل رہی تھی، غصّے سے چہرہ سُرخ ہو رہا تھا، ہونٹ پھڑک رہے تھے، جسم تک کانپ رہا تھا۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ، سبھی خاموش ہو رہے۔ لیکن ایک نوجوان بول اٹھا۔

"آپ بوڑھے ہیں، آپ الگ بیٹھئے، ہم کافروں سے سمجھ لیں گے!"

دادا چیخ اُٹھے۔

"کلو کا بیٹا، زبان سنبھال کے بول۔ تو کنہیں کافر کہہ رہا ہے؟ اور میرے بڑھاپے پہ مت جا۔ میں مسجد میں چل رہا ہوں، پہلے میری ہی قربانی ہوئے گی تب گائے کی قربانی ہوگی؟"

سبحان دادا وہاں سے غصّے کی حالت میں مسجد میں آئے۔ نماز پڑھی۔ پھر تسبیح لے کے مسجد کے دروازے کی چوکھٹ پر "میری لاش پر سے گزر کر ہی کوئی اندر جا سکتا ہے" کہہ کے بیٹھ گئے۔ اُن کی آنکھیں بند ہیں، لیکن آنسوؤں کی جھڑی ان کے گالوں سے ہوتی ہوئی، ان کی ڈاڑھی کو بھگوتی، لگاتار جاری ہے۔ ہاتھ میں تسبیح کے دانے گردش کر رہے ہیں اور ہونٹوں میں ذرا ذرا سی جنبش ہے۔ ورنہ ان کا جسم سنگ مرمر کے بُت کی طرح معلوم ہو رہا ہے۔ ساکت و ساکن۔ رفتہ رفتہ مسجد کے نزدیک لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ پہلے مسلمان، پھر ہندو بھی۔ اب گائے کی قربانی کا سوال دادا کے آنسوؤں کے دھارے میں بہہ کے نہ جانے کہاں چلا گیا! مجسم فرشتہ نظر آتے تھے! فرشتہ، جس کے روئیں روئیں سے محبت اور بھائی چارے کی شعاعیں نکل کے فضا کو منوّر کر رہی تھیں۔

ابھی اس دن میری رانی، میرے دو سال جیل میں رہ جانے کے بعد، اتنے لمبے عرصے تک راہ دیکھتی دیکھتی، آخر مجھ سے ملنے گیا جیل میں آئی تھی۔

اتنے دنوں کی جدائی کے بعد، ملنے پر، جو سب سے پہلی چیز اس نے میرے ہاتھوں میں دی، وہ تھے ریشم اور سوت کے عجیب و غریب ڈھنگ سے لپیٹے لپٹائے، ڈورے اور بدھیاں، گنڈے وغیرہ ——— یہ سورج دیوتا کے ہیں، یہ اننت دیوتا کے، یہ گرام دیوتا کے۔ یونہی گناتے گناتے آخر میں بولی: "یہ حسین صاحب کے گنڈے ہیں۔ آپ کو میری ہی قسم، انھیں ضرور پہن لیجیے گا۔"

یہ سب میری ماں کی منتوں کی یادگار نشانیاں ہیں۔ ماں چلی گئیں، پتاجی چل بسے، رانی چار بچوں کی ماں بن چکی ہے، میں چار بچوں کا باپ بن چکا ہوں، پھر بھی یہ منتیں اب تک نبھائی جا رہی ہیں۔ رانی جانتی ہے، میں لامذہب ہوں، اس لئے جب جب ان کے موقعے آتے ہیں، خود انھیں میرے گلے میں ڈال دیتی ہے۔ آج اس جیل میں، جیل کے افسروں اور خفیہ پولیس کے سامنے اُس نے ایسا نہیں کیا۔ لیکن، قسم دینے سے نہیں چوکی۔ میں نے ہنس کے، گویا، اس کی دلجمعی کر دی۔

رانی چلی گئی، لیکن وہ گنڈے اب میرے سوٹ کیس میں احتیاط سے رکھے ہیں۔ جب جب سوٹ کیس کھولتا ہوں اور حضرت امام حسین رضؓ کے ان گنڈوں پر نظر پڑتی ہے، تب تب دو عجیب و غریب تصویریں آنکھوں کے سامنے ناچ جاتی ہیں۔ پہلی کربلا کی۔

ایک طرف صرف بہتّر آدمی ہیں، جن میں بچے اور عورتیں بھی شامل ہیں۔ اس چھوٹی سی جماعت کے سردار ہیں حضرت امام حسینؑ انھیں بار بار اصرار کر کے کوفہ والوں نے

بلایا ہے، ان کی خلافت قبول کرنے کے لیے! لیکن بجائے خلافت قبول کرنے کے۔ ان کے لیے ایک چلّو پانی تک کا ملنا محال کر دیا گیا ہے۔ سامنے دریائے فرات بہہ رہا ہے، لیکن اس کے گھاٹ گھاٹ پر پہرے ہیں۔ انھیں پانی لینے نہیں دیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ بدکار، بدچلن یزید کی خلافت تسلیم کرو، ورنہ پیاسے تڑپ کے مرو!

بچے پیاس سے بلک رہے ہیں، ان کی ماں بہنیں تڑپ رہی ہیں۔ ہائے لیے ایک چلو پانی! —— میرے معصوموں کے حلق سوکھے جا رہے ہیں، ان کی سانسیں رکی جا رہی ہیں! پانی، پانی، ایک چلّو پانی!

پانی کی تو ندی بہہ رہی ہے۔ اور تمھیں تو دولت و عزت بھی کم نہیں عنایت کی جائیگی کیونکہ تم خود رسولؐ کے نواسے جو ہو! لیکن شرط ایک ہے —— یزید کے ہاتھوں پر بیعت قبول کرو!

یزید کے ہاتھوں پر بیعت؟ بدکار و بدچلن یزید کی خلافت قبول کرے اور رسول کا نواسہ؟ ہو نہیں سکتا! ہم ایک چلو پانی میں ڈوب مرنا پسند کریں گے، لیکن یہ ذلیل کام رسولؐ کے نواسے سے نہیں ہوگا!

لیکن بچوں کے لیے تو پانی لانا ہی ہے! انھیں یوں جیتے جی تڑپ کر مرنے نہیں دیا جا سکتا!

ایک طرف بہتّر آدمی —— جن میں بچے اور عورتیں بھی۔ دوسری طرف بدکار یزید کی لاانتہا مسلح فوج! جنگ ہوتی ہے۔ حضرت امام حسین ؑ اور ان کا پورا قافلہ اس کربلا کے میدان میں شہادت پاتا ہے! شہیدوں کے خون سے اس صحرا کے ذرّے سرخ ہو اٹھتے ہیں، بچوں کی تڑپ اور بے پناہ عورتوں کی چیخ سے فضا تھرا اٹھتی ہے۔

ایسے دردناک سانحے کی مثال دُنیا کی تاریخ میں کوئی اور ملنی مشکل ہے محرم اسی المناک دن کی یادگار ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں یہ یادگار ہر مسلمان مناتا ہے۔ بھائی چارہ بڑھنے پر ہندوؤں نے بھی اسے اپنا تیوہار بنالیا تھا، جو لائق صد تحسین تھا۔

اور دوسری تصویر سبحان دادا کی۔

جن کے کندھوں پر چڑھ کے میں محرم دیکھنے جایا کرتا تھا۔

وہ کشادہ پیشانی، وہ سفید داڑھی، وہ شفقت بھری آنکھیں، وہ شہد ٹپکانے والے ہونٹ، ان کا وہ نورانی چہرہ جن کی جوانی اللہ اور کام کے درمیان برابر حصوں میں بنٹی تھی۔ جن کی ضعیفی اللہ ہی کے لئے وقف تھی۔ جن کے دماغ میں اعلیٰ خیالات تھے۔ اور جن کے دل میں محبت کا دریا موجزن تھا ——— جو اپنے پرائے سب کو یکساں طور پر سینچتا اور ٹھنڈک پہنچاتا ہے!

میرا سر عقیدت سے جھکا ہے۔ کربلا کے شہیدوں کے سامنے! میں سلام محبت پیش کرتا ہوں۔ اپنے پیارے سبحان دادا کو!

بُدھیا

ایک چھوٹی سی بچھیا (ممنا) پھدکتی ہوئی آکر چمبیلی کی تازہ نرم نرم پتیوں کو تابڑ توڑ نوچنے لگی۔ اُس دن تک مجھ میں وہ فنکارانہ احساسات نہیں جاگے تھے کہ اس ننھے، خوبصورت جانور کا وہ پھدکنا، اپنے لمبے کانوں کو پھٹکارتے ہوئے پتیوں کو نوچنا، پھر چونکی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے لگاتار منہ چلانا اور جب تب شاید ماں کی یاد میں، میں میں چلّا اٹھنا۔ میں متحیر اور محو ہو کر دیکھتا سنتا رہتا۔ اُس وقت تو سب سے بڑی ممتا تھی اُس چمبیلی پر، جس کی قلم میں دور کے گاؤں سے لایا تھا، جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے لگایا اور سینچا تھا اور جس کی ایک ایک پتی نکلتے دیکھ کے میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ اُس چھوٹی سی شریر بچھیا نے سب کا ستیاناس کر دیا ——— میں غصّے میں پھنکار، اُسے مارنے دوڑا۔ وہ ہرن کے بچّے کی طرح چھلانگیں لگاتی بھاگی! میں پیچھے لگا۔

مت ماریئے بابو ——— یہ بدھیا تھی۔ بدھیا ایک چھوٹی سی بچی۔ سات

آٹھ سال سے زیادہ کی کیا ہوگی! کمر میں بکر نگے کی تلی لپیٹے جس میں کتنے ہی پیوند لگے تھے اور جو مشکل سے اس کے گھٹنوں کے نیچے پہنچتی تھی۔ سارا جسم ننگ دھڑنگ، گرد و غبار سے اٹا۔ سانولے چہرے پر سیاہ بالوں کی لٹیں بکھری ہوئی جن میں گرد تو یقینی تھی۔ جوئیں بھی ضرور رہی ہوں گی —— ایک ناک سے پیلا 'ینٹا' نکلتا ہوا جسے وہ بار بار سُڑکنے کی کوشش کرتی۔ اس کی بولی سن کے اور شاید یہ صورت دیکھ کے، خواہش ہوئی ایک طمانچہ ابھی اس کے گال پر جڑ دوں کہ اچانک اس کے پاؤں کے پاس جو نظر گئی تو دھیان اس طرف کھنچ گیا اور میرا لڑکپن کا دل وہیں جا اُلجھا۔

ارے، تو نے یہ کیا بنا رکھا ہے؟ —— میں نزدیک جا کے دیکھنے لگا۔ دیکھا، نزدیک کے پوکھر سے گیلی چکنی مٹی لا کے اُس نے طرح طرح کے کھلونے بنا رکھے ہیں۔ کھیت سے سرسوں، چنا، مٹر وغیرہ کے پھول لا کے اُن کھلونوں کو خوب سجا رکھا ہے اُس نے۔ کھلونوں کی خاص شکلیں تو تھی نہیں، ہاں آدمی کی سی بناوٹ تھی، جو رنگ برنگ پھول سے سجے ہونے کی وجہ سے یقینی اچھے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ یہ کیا ہے؟ وہ کچھ شرمائی۔

آپ ماریئے گا نہیں تو بتاؤں!

آج بیٹا ضرور یہ معاف کر دیا —— وہ مسکرا پڑی۔ بیٹھ گئی —— بیٹھے نہ! اس گندگی میں میں کیوں بیٹھتا، جھک کے دیکھنے لگا؟ اس نے کہنا شروع کیا۔

یہ ہے دولھا۔ سر پر مور۔ سرسوں کے پھولوں کی طرف اشارہ کیا۔ بسنتی مور۔ یہ ہے دُلہن۔ کیسی اچھی چندری تھی، مٹر چنے کے پھولوں کی۔ ان کی ہوگی شادی۔ خوب بجیں گے باجے دو تین بار اُس نے جیٹ کو پیٹا، پھر منہ سے سیٹی بجائی۔ ڈھول بھی، شہنائی بھی!

یہ ہے کھبر گھر (حجلۂ عروسی)، ڈھول سے چوکور گھیر کے بنایا ہوا۔ یہ ہے پھول سیج۔ آم کے ہرے پتے پر کچھ پھول بکھرے ہوئے۔ اس پر سوئیں گے دونوں، اور میں گاؤں گی گیت۔ وہ کچھ گنگنانے لگی۔ گاتی اور جھومتی۔ میں کچھ دیر انہماک سے دیکھتا اور سنتا رہا۔ پھر میرا دھیان اپنی ہتھیلی کی طرف گیا۔ دوڑا ایک ایک پتی گنتا، افسوس کرتا، بٹھیا کو زندہ چبا جانے کی قسمیں کھاتا اور بدھیا کو گالیاں دیتا......

مالک، ذرا گھاس کو ہاتھ لگا دیجئے نہ!

سر نیچا کئے کسی بات پر دل ہی دل میں ردّ و قدح کرتا میں گاؤں سے اتر کی سڑک پر شام کو ہوا خوری کر رہا تھا کہ یہ آواز سن، سر اٹھا کے دیکھا۔ جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ سڑک کے نیچے، کھیت میں ایک جوان سی لڑکی کھڑی دکھائی دی۔ گھاس کا گٹھّر، اس کے پاؤں کے پاس بغل میں پڑا تھا۔

میں جھلّا اٹھا۔ اس کی شوخی پر غصّہ آیا۔ میں اب شہری آدمی ہوں۔ صاف کپڑے پہنتا ہوں۔ گنواروں کی گندگی سے دور دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر، میں کوئی گھسیارا یا چرواہا تھوڑا ہی ہوں جو گھاس کے گٹھّر اٹھاتا پھروں؟ گاؤں میں ایسا کون ہے جو مجھ سے یہ کہنے کی جرأت کرے؟ لیکن دیکھئے اسے جس نے ....

اٹھا دیجئے نہ!

میں نے گھور کے اس کے چہرے کو دیکھا۔ خد و خال اور آواز میں تال میل بٹھلایا۔ ارے یہ تو بدھیا ہے! جوان ہو گئی؟ اتنی جوان؟ اتنی جلد؟

اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی نہیں شام ہو رہی ہے بیچاری کو اور کون اٹھا دے گا؟

رحم کھاکے میں نے گھاس کے گٹھر میں ہاتھ لگا دیئے۔ وہ گٹھر لے کے جھومتی چلی گئی۔

اسی وقت ایک قہقہہ سُنائی دیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں جگدیش میرے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ آخر آپ کو بھی اُس نے پھانسا! ——— جگدیش کی آنکھوں میں شرارت تھی، آواز میں طنز۔ پھر اس نے گویا بُڑھیا نامہ، سنانا شروع کر دیا۔

اب بُڑھیا بیوند والی بُڑھیا نہیں ہے۔ اب اس کی چُندری کا رنگ کبھی پھیکا نہیں پڑتا۔ اس کی چولی سیوائی ہٹی کا درزی سیتا ہے۔ مانا وہ روز گھاس کے لئے آتی ہے لیکن اس کے ہاتھوں میں چھلوں کی کیا بات، آپ گھنٹے بھی نہیں پائیں گے۔ رنگ وہی سانولا ہے! لیکن گڈھے کے سڑے پانی کا سا جمود نہیں ہے۔ جمنا کی کل کل چھل چھل ہے۔ جس کے کنارے پر کتنے ہی کرشن بنسی بجاتے، کتنے ہی نند کے لال راس لیلا کے خواب دیکھتے۔ بُڑھیا جس میدان میں نکل جاتی، زندگی ترنگیں لیتی۔ اس کے بالوں میں چمیلی کا تیل چپ چپ کرتا ہے، اس کی مانگ میں ٹکی بندیا چم چم کرتی ہے۔ کسی برندا بن میں ایک تھے گوپال اور ہزاروں تھیں گوپیاں۔ یہاں ایک ہے گوپی اور ہزاروں گوپال۔ ان گوپالوں کو ایک ناتھ سے ناتھ کر نچانے میں بُڑھیا کو جو لطف آتا، وہ اُس گوپال کو سینکڑوں پھن والے کالے ناگ کو ناتھنے اور اُس پھن پر ناچنے میں بھی کہاں ملا ہوگا؟ ——— معلوم ہوتا، رادھا رانی دوآپر، کا بدلا اس کلجگ میں بُڑھیا کے ذریعے مرد ذات سے لے رہی ہوں۔ وہ تڑپتی رہی اور یہ تڑپاتی ہے۔

اُف، غضب ہو گیا ——— میرا اپا کباڑ دل چیخ رہا تھا اور میں سر نیچا کئے اندھیرے میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا؟ جگدیش نے دوسری راہ پکڑی تھی۔ تھوڑی دور چلنے پر گاؤں کے نزدیک پہنچتے پہنچتے، مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری بغل سے بدن

چھوتا ہوا کوئی بڑی تیزی سے نکل گیا۔ میری گردن آپ سے آپ پیچھے مڑی۔

معاف کیجئے۔ یہ دوسرا قصور ہوا۔ وہ ٹھٹھک کے کھڑے ہوگئی اور بولی۔ وہ بدھیا تھی۔ میں سُلگ اٹھا ——— بدمعاش، بدچلن! اُس کے سہمنے اور شرمانے کے بدلے، وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بے دھڑک نزدیک آکے کہنے لگی۔

بابو، یاد ہے، میری پٹھیا ایک چمیلی چر گئی تھی؟

اندھیرے میں بھی اُس کی بتیسی چمک اٹھی۔

بدمعاش، چل بھاگ!

بلاشبہ اس وقت میرا چہرہ لال انگارہ بن رہا ہوگا۔

اور وہ دولھا، وہ دلہن، وہ کہیر، وہ بھول کی سیج، اور وہ گیت! گیت سنئے گا بابو۔

سجنی چل لیہوں پیونا گھر نا،

جائت ہیں لاگو پرم ڈرنا۔

وہ گاتے گاتے بھاگی۔ ہنستی، اٹھلاتی۔ اُف کتنی بے شرم، بے حیا....!

میں کیا کیا نہ بڑبڑایا کیا؟ اور دور، دور سے اس کے قہقہوں کی آوازیں آتی رہیں۔

گیہوں کی کٹنی ہو رہی تھی۔ میرے بھائی نے کہا۔ بھیا، آج مزدور زیادہ ہوں گے، لوٹ لیں گے، ذرا کھیت پر چلئے گا؟ بس آپ کو صرف کھڑا رہنا ہے۔ کام تو آپ ہی آپ ہوتا رہے گا۔

خون میں جو بچی بچائی کسان کی سرشت ہے۔ اس نے نئے کام اور نئے تجربے

کے ولوے سے مل کے، مجھے کھیت میں لا کھڑا کیا۔

ایک پہر رات رہے ہی، تاکہ گیہوں کے پکے خوشے ڈنٹھل سے جھڑ نہ جائیں چاندنی میں جو کٹنی ہو رہی تھی، وہ اب ختم ہو چلی تھی۔ بوجھے باندھے جا رہے تھے۔ مزدور بوجھے باندھتے، ان کی عورتیں اور بچے گرے ہوئے خوشوں کو اپنے لئے چنتے۔ گرے ہوئے خوشوں کے بہانے کہیں پھیلے ہوئے سالم پودوں کو ہی نہ چن لیں، اسی لئے میری تعیناتی ہوئی تھی۔

میں ایک جگہ پر کھڑا، ہوشیاری سے اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا؟ لیکن کھیت کے ایک کونے پر مجھ سے کافی دور، ایک مزدور کے پیچھے ایک ادھیڑ عورت اور اس کے کئی بچے تابڑ توڑ خوشے چن رہے تھے۔ اور میں کہوں، کچھ "فاؤل پلے" کر رہے تھے۔

اے! کون عورت ہے؟ —— تو کیا کر رہی ہے؟

میری اونچی آواز کو عورت نے جیسے سن کر بھی نہیں سنا۔ ہاں اس کا مرد شاید اُسے ڈانٹ رہا تھا۔ ایسا لگا۔

ایک بار۔ دو بار۔ تین بار! اپنی عدول حکمی دیکھ، غصّے میں چور، میں اس طرف بڑھا۔ مجھے اس طرف بڑھتے دیکھ، اس کے چاروں بچّے، جو چھ سال کی عمر کے اندر ہی ہوں گے۔ اس عورت کے قریب آ گئے۔ چھوٹے نے جو ڈیڑھ سال کا ہوگا، پھدک کر اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ کچھ دور سے ہی میں نے ڈانٹا۔

تو کیا کر رہی ہے رے؟

ہاتھ سے چُننے کا کام جاری رکھتے ہوئے، جُھکے ہی جُھکے، اُس نے منہ پھیر کے میری طرف دیکھا اور بولی۔ سلام بابو!

ایں یہ کون؟ ارے بُدھیا؟ یہ وہی بُدھیا ہے، جو کبھی تُتلی پہنے تھی؟ کبھی جس کی چندری کا رنگ پھیکا نہیں پڑتا تھا؟ یہ کیا ہوا؟ اس کا وہ بچپن؟ اس کی وہ جوانی! اور یہ.... ہاں بڑھاپا ہی تو ہے۔ پھٹا کپڑا، چولی کا نام نہیں۔ بال بکھرے، چہرہ سوکھا۔ گالوں میں گڈھے، آنکھوں میں حلقے۔ اور تو اور ——— جو کبھی اپنی گولائی، گٹھن اور اٹھان سے نوجوانوں کو پاگل بناتے تھے۔ اس کے وہ دونوں جوانی کے پھول۔ جبکہ وہ جھکی خوشہ چُن رہی ہے۔ بکری کے تھن جیسے جھول رہے ہیں بے جان، بے حس!

بُدھیا!

ہاں بابو!

منہ پھیر کے اُس نے میری طرف سوکھی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور اپنے کام میں لگ رہی ہے۔

تب تک اس کے آدمی نے جو بوجھ باندھ چکا تھا۔ اسے پکارا۔ ذرا ادھر آ، ہاتھ لگا دے۔

بُدھیا خوشے چننا چھوڑ، تن کر کھڑی ہوئی اور میری طرف دیکھ، پھر ایک ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس طرف بڑھی۔

اس کے تن کر کھڑے ہوتے ہی، میں نے دیکھا۔ اس کا پیٹ باہر نکلا ہے۔ پاؤں اٹھ نہیں رہے ہیں۔ اُوہ ——— یہ حاملہ ہے! تو ٹھہر، میں بوجھا اٹھائے دیتا ہوں! میں نے کہا۔

نا بابو، آپ سے بوجھا اٹھانے کو نہیں کہوں گی؟ آپ ناراض ہو جاتے ہیں! اس کے سامنے کے دو دانت، کچھ عجیب حسرت برساتے، چمک پڑے۔

مجھے ایک دھکا سا لگا۔ پُرانی باتیں یاد آگئیں۔ وہ شام۔ وہ گھاس کا گٹھر، بُڈھیا
کی التجا، جگدیش کا طنز، اپنی بوکھلاہٹ۔ اس کا پاگل پن۔ اُسی وقت اس کا چھوٹا
بچہ رو اٹھا۔ وہ اس کی طرف لپکی اور میں سیدھا اُس کے آدمی کے پاس پہنچا۔ بوجھا اٹھا
دیا۔ وہ ہٹا کٹا جوان۔ بوجھا لئے جھومتا چلتا بنا۔ ادھر بچے کے منہ میں سوکھا سینہ دیتی
چمکارتی، دلارتی، بہلاتی بُڈھیا بولی۔

بابو آپ کے کتنے بچے ہیں؟ یہ بڑے شیطان ہوتے ہیں بابو! تن بدن کو برباد کر کے
بھی انھیں چین نہیں ملتا۔ یہ تنگ کر مارتے ہیں!

باقی تین بچے بھی اُس سے لگے کھڑے تھے۔ ایک کے بدن پر ہاتھ پھیرتی، دوسرے
کی پیٹھ ٹھونکتی، تیسرے پر آنکھوں سے ہی پیار انڈیلتی، گود کے ننھے کو تھپتھپاتی، اسی
حالت میں مست وہ کیا کیا نہ مجھ سے کہتی رہی۔ میں ٹکٹکی لگائے اس کی طرف دیکھتا رہا
آنکھیں اس کی طرف دیکھتیں۔ اور دماغ اپنا کام کئے جاتا۔

ہاں برسات بیت گئی۔ سیلاب اُتر گیا۔ اب ندی اپنے پیٹ میں ہے، سبک
رفتار سے بہتی ہوئی۔ نہ طوفان ہے۔ نہ ہاہاکار۔ کیچڑ اور خس وخاشاک کا نام ونشان نہیں
پُرسکون، ٹھنڈی گنگا!

میرے سامنے پُرعظمت مادریت ہے۔ لائقِ تعظیم، قابلِ پرستش!

